علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

خطباتِ سیرت

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ خدام القرآن لاہور

خُطباتِ سیرت
علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

از

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مکتبہ خُدّامُ القُرآن لاہور

36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون : 3-35869501

maktaba@tanzeem.org

مؤسس انجمن خدام القرآن جناب ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کی اپنی دلی خواہش اور جدوجہد کے تقاضوں کے عین مطابق' مرحوم کے تمام قانونی وارثین ہر مسلمان کو ڈاکٹر صاحبؒ کی طبع شدہ تصنیفات/ تالیفات' آڈیوز' ویڈیوز کو طبع/ تیار کر کے شائع کرنے کی کھلی اجازت دیتے ہیں (چاہے قیمتاً ہو یا مفت تقسیم) اور اس کے لیے کسی پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں۔ ہمارا کسی قسم کی رائلٹی یا ''محفوظ حقوق'' کا تقاضا بھی نہ ہے اور نہ ہوگا' البتہ تیار کردہ مواد (آڈیوز یا ویڈیوز) اور کتب کے چند نسخے ہمارے ریکارڈ کے لیے بھیج دیے جائیں تو ممنون ہوں گے۔ تاہم ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی ناپسندیدہ کوشش مثلاً تبدیلی الفاظ' غلط اقتباس' سیاق وسباق سے الگ کر کے جملے کا حوالہ یا اس کا ایسا استعمال جس سے ڈاکٹر صاحب مرحوم اور ہمارے موقف کی صحیح ترجمانی نہ ہو اور جس سے ہماری عزت وشہرت پر حرف آئے' تو ہم اس شخص کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا مکمل حق محفوظ رکھتے ہیں۔

نام کتاب ——— خطباتِ سیرت ﷺ
طبع اوّل (مئی 2017ء) ——— 3300
ناشر ——— ناظم نشرواشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور
فون: 35869501-3
مطبع ——— مکتبہ جدید پریس لاہور
قیمت ——— 160 روپے

ISBN: 978 - 969 - 606 - 048 - 2

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

ترتیب

تقدیم ——— 4

خطبہ ① ——— 7

منصبِ رسالت اور اس کا مقصد

خطبہ ② ——— 33

تکمیلِ رسالت اور اس کے لوازم

خطبہ ③ ——— 57

حیاتِ طیبہ کا مکی دور

خطبہ ④ ——— 85

حیاتِ طیبہ کا مدنی دور

خطبہ ⑤ ——— 123

دعوتِ محمدیؐ کا بین الاقوامی مرحلہ اور
خلافتِ صدیقی میں انقلابِ نبویؐ کا استحکام

خطبہ ⑥ ——— 151

خلافتِ فاروقیؓ و عثمانیؓ
اور انقلابِ نبویؐ کی توسیع

خطبہ ⑦ ——— 179

انقلابِ نبویؐ کے خلاف تخریبی ردِّ عمل
یعنی الفِتنۃُ الکُبریٰ

تقدیم

ڈاکٹر اسرار احمد

اس میں ہرگز کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ تاریخ انسانی کا جو عظیم ترین' ہمہ گیر ترین اور صالح ترین انقلاب آج سے لگ بھگ چودہ سو سال قبل برپا ہوا تھا' اس کے اساسی و بنیادی عوامل دو ہی تھے —— ایک اللہ کی کتاب قرآن حکیم اور دوسرے اس کے معلم نبی اکرم ﷺ ——!!

ان دونوں کے مابین نسبت و تعلق کا معاملہ بڑا عجیب ہے' یعنی یہ کہ بظاہر یہ دونوں جدا جدا حقیقتیں ہیں لیکن بباطن ''من تو شُدم تو من شُدی' من تن شُدم تو جاں شُدی!'' کے مصداق ایک حقیقتِ واحدہ' یا زیادہ سے زیادہ یوں کہہ لیں کہ ایک ہی تصویر کے دو رخ یا ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں! چنانچہ خواہ یوں کہہ لیا جائے کہ ؎

''اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا!''

خواہ یہ کہ ع ''قاری نظر آتا ہے' حقیقت میں ہے قرآن!'' بات ایک ہی ہے!!

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے سورۃ البیّنۃ میں: ''اَلْبَیِّنَۃ'' کی تشریح یوں کی کہ: ﴿رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً ۝ فِیْہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ۝﴾ یعنی اللہ کے رسول ﷺ اور وہ انتہائی پاکیزہ صحیفے جن میں درج ہی وہ تحریریں ہیں جو صاف اور سیدھی بھی ہیں اور قائم و دائم بھی' دونوں مل کر اس ''البیّنہ'' کی صورت اختیار کر لیتے ہیں' جس کے بعد حق و باطل گڈمڈ نہیں رہ سکتے' باطل کو لازماً حق سے جدا ہونا پڑتا ہے!

قرآنِ حکیم کے ساتھ راقم الحروف کے ربط و تعلق کی داستان یوں تو زیادہ طویل ہے اور

اس کے تفصیلی ذکر کی یہاں کوئی حاجت نہیں۔ البتہ اس قدر عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اوائل ۱۹۶۶ء سے اواخر ۱۹۷۰ء تک پانچ سال تو ایسے بیتے کہ مولانا حسرت موہانی مرحوم کے اس شعر کے مصداق کہ:

''ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
اِک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی!''

کچھ مطب کی مشقت بھی چلتی رہی' لیکن اکثر و بیشتر توانائیاں خدمتِ قرآن ہی کے لیے وقف رہیں۔ لیکن اس کے بعد سے بفضلہٖ تعالیٰ وبعونہٖ اس کام میں وہ یکسوئی حاصل ہے کہ دوئی کا کہیں دور دور گزر نہیں۔ فَلَهُ الْحَمْدُ وَالْمِنَّة!

اگرچہ راقم الحروف پر اس سفر کے بالکل آغاز ہی میں وہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو چکی تھی جسے غایت اختصار کے باوصف حد درجہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ ادا فرمایا ہے معلّمِ اُمت' صدیقۂ کبریٰ' اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ان الفاظ میں کہ: ''كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ'' یعنی آپ ﷺ کی سیرت قرآنِ پاک ہی ہے!'' چنانچہ اس عرصے کے دوران راقم الحروف نے لاتعداد مواقع و مقامات پر سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر تقاریر کیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسے 'درسِ قرآن' ہی کی طرح اپنا موضوع راقم نے ۱۹۷۸ء سے بنایا۔

تقریب اس کی یوں ہوئی کہ 'پاکستان سُنّی کونسل' نے خالق دینا ہال کراچی میں یکم تا بارہ ربیع الاوّل ۱۳۸۸ھ سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر ایک روزانہ نشست منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور کسی حسنِ ظن کے باعث اس کے لیے مجھ سے استدعا کی گئی۔ میں اپنی لاہور کی مستقل مصروفیات کے باعث پورے بارہ دن تو نہ دے سکا' البتہ یکم تا ۶ ربیع الاوّل (مطابق ۱۰ تا ۱۵ فروری ۱۹۷۸ء) اور پھر ۹' ۱۰ ربیع الاوّل (۱۸' ۱۹ فروری) کل آٹھ تقریریں راقم نے کیں' جن میں نبوت و رسالت سے متعلق بنیادی مضامین بھی زیر بحث آئے' حیاتِ طیبہ کے مختلف ادوار پر بھی روشنی ڈالی گئی' خلافتِ راشدہ بھی زیر بحث آئی' اور مسلمانوں کے عروج و زوال کے ادوار کا ذکر بھی ہوا' اور بالآخر ادھر توجہ دلائی گئی کہ ہم مسلمان اس وقت کس مقام پر کھڑے ہیں اور سیرت النبی کی روشنی میں ہمارا فرضِ منصبی کیا ہے اور سیرتِ مطہرہ ﷺ کی روشنی میں اس کی ادائیگی کے لیے لائحہ عمل کون سا سامنے آتا ہے۔

ان تقریروں سے سامعین کو تو کچھ حاصل ہوا یا نہیں' خود مجھ پر بعض حقائق روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئے۔ چنانچہ ایک طرف تو معلّمِ اُمت ﷺ کے متذکرہ بالا حکیمانہ قول کے معانی و مفہوم سے بھی دو پہلو سامنے آئے۔ یعنی یہ کہ قرآنِ حکیم اور سیرتِ رسول ﷺ باہم لازم و ملزوم ہیں' اس اعتبار سے بھی کہ قرآنی تعلیمات کا پیکر مجسّم ہیں نبی اکرم ﷺ —— گویا مصحف قرآنِ متلو ہے تو آنحضور ﷺ قرآنِ مجسّم ہیں —— اور اس اعتبار سے بھی کہ اگر قرآن کو ترتیبِ نزولی سے مرتب کر دیا جائے تو وہ سیرتِ رسول ﷺ بن جائے گا۔ گویا آنحضور ﷺ کی سوانح حیات بالخصوص آغازِ وحی کے مصلاً قبل سے لے کر حیاتِ دنیوی کے آخری سانس تک کا مفصل و مکمل ریکارڈ بھی خود قرآن ہی ہے۔ اور دوسری طرف یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی کہ اگرچہ دعوتِ دین کی اساسِ محکم تو درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم قرآن ہی ہے لیکن خود قرآن کے افہام و تفہیم کا مؤثر ترین اور سہل ترین ذریعہ سیرت النبیؐ کا صحیح اور واقعاتی بیان ہے۔ واللہ اعلم!

بہرحال کراچی کے اس پہلے تجربے کو راقم نے لاہور میں دہرایا اور ۷/اپریل تا ۹ جون ۱۹۷۸ء ہر جمعہ کو بعد نماز مغرب ماڈل ٹاؤن لاہور کے دس[1] بلاکوں کی جامع مساجد میں دس تقریریں کیں' جن میں شرکاء کی کثرتِ تعداد اور ان کا ذوق و شوق یادگار رہے گا۔ یہ سلسلۂ تقاریر ٹیپ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔

(میثاق' فروری ۱۹۷۹ء)

پ۔ن (مئی ۲۰۱۷ء)

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کا سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر یہ مربوط سلسلۂ تقاریر ۸۰-۱۹۷۹ء کے دوران ماہنامہ میثاق میں شیخ جمیل الرحمٰن صاحبؒ کی ترتیب و تسوید کے ساتھ سات اقساط میں شائع ہوا۔ ۲۰۰۷ء کے دوران ان تقاریر کو مزید ایڈیٹنگ کے بعد میثاق میں مکرر شائع کیا گیا —— اور اب یہ سلسلہ تقاریر ''خطباتِ سیرت'' کے عنوان سے کتابی صورت میں پیش خدمت ہے۔ (مدیر شعبہ مطبوعات)

❁❁❁

(۱) ماڈل ٹاؤن کے 'H' بلاک میں اہلِ سُنّت کی کوئی مسجد نہیں ہے' صرف اہلِ تشیّع کا مدرسہ 'جامع المنتظر' ہے۔ لہٰذا اس کے حصے کی تقریر بھی 'A' بلاک کی جامع مسجد میں ہوئی۔

سلسلۂ خطبات ①

منصبِ رسالت اور اُس کا مقصد

تاریخ کے صحیح فہم کی ضرورت و اہمیت

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی قوم کی تاریخ اُس کے افراد کو خود شناسی کی دولت عطا کرتی ہے! یعنی اگر کوئی قوم یا کوئی اُمت اپنی تاریخ سے غافل اور ذہناً غیر متعلق ہو جائے تو یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے آپ سے غافل ہو جائے اور اپنے آپ کو بھول جائے' بالفاظِ دیگر خود فراموشی کی کیفیت میں مبتلا ہو جائے۔ تاریخ درحقیقت کسی قوم کی اجتماعی یادداشت ہوتی ہے' جس سے اُس قوم کے افراد کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہماری روایات کیا ہیں..... ہم اگر کوئی بامقصد گروہ یا جماعت تھے تو ہمارا وہ مقصد کیا تھا اور اس کے اعتبار سے ہم اِس وقت کہاں کھڑے ہیں..... اور ہماری اجتماعی جدوجہد کا رُخ کیا ہونا چاہیے؟ یہ تمام اُمور درحقیقت اپنی تاریخ کے صحیح فہم ہی سے اس قوم کو میسّر آسکتے ہیں۔ اور اگر کوئی قوم اپنی تاریخ سے غافل ہو جائے یا اس کا کوئی مسخ شدہ تصوّر (distorted version) اس کے سامنے رہے تو اس کے معانی یہ ہیں کہ وہ قوم اپنے اجتماعی نصب العین سے غافل ہے۔ مجھے یہاں اس امر کی زیادہ وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ کوئی قوم کسی اجتماعی نصب العین کے بغیر اپنا وجود باوقار اور باعزت طور پر برقرار نہیں رکھ سکتی' چاہے برائے نام زندہ رہنے کو وہ بے شک رہے' اس طرح کہ نہ اس کا کوئی وقار ہو اور نہ کوئی عزت' نہ دنیا میں اس کی کوئی حیثیت ہو' نہ اقوامِ عالَم میں اسے کسی معاملے میں کوئی اہمیت حاصل ہو' جیسے کہ اِس وقت ہم جی رہے ہیں۔ باعزت و باوقار قوم وہی ہوگی جس کے سامنے کوئی اجتماعی نصب العین ہو۔ اس سلسلۂ تقاریر کی اصل

غرض و غایت یہی اجتماعی خود شناسی ہے۔ علامہ اقبال مرحوم کا ایک مشہور مصرع ہے: ع ''اپنی خودی پہچان او غافل افغان!'' یہی بات ایک مسلمان سے بھی کہی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے کہ مَیں کون ہوں' کس اُمت سے میرا تعلق ہے' میرا اجتماعی نصب العین کیا ہے' میرا ماضی کتنا شاندار تھا اور میرے اَسلاف کی روایات کتنی عظیم تھیں! وہ غور کرے کہ مَیں کتنے عظیم ورثے کا وارث ہوں اور میرے سامنے جدوجہد اور اجتماعی سعی کے لیے نقشہ کیا ہے: ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا!

یہ تمام باتیں وہی ہیں جو درسِ قرآن کے ضمن میں وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہتی ہیں۔ درسِ قرآن کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم سمجھیں کہ بحیثیتِ اُمتِ مسلمہ ہمارا مقام کیا ہے اور ہمارے فرائض کیا ہیں؟ اور یہی درحقیقت پیشِ نظر ہے اس سلسلۂ تقاریر سے کہ یہ بات سیرت اور تاریخ کے حوالے سے بھی مبرہن اور مدلّل ہو کر سامنے آ جائے۔ یعنی مقصد وہی ہے' جیسا کہ علامہ اقبال مرحوم نے بیان کیا ہے: ؎

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را!

یہ شعر و سخن' یہ غزل گوئی مقصود نہیں: ؎

من اے میرِ اُممؐ داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند!

علامہ اقبال سردارِ اُمم نبی اکرم ﷺ کے حضور فریاد کناں ہیں کہ مجھ پر تو ظلم کیا ہے میرے ساتھیوں اور دوستوں نے کہ مجھے غزل خواں اور شاعر سمجھ لیا ہے۔ کیسا پیارا انداز ہے علامہ اقبال کے احتجاج کا! کہتے ہیں: ع ''شاعری زیں مثنوی مقصود نیست!'' کہ شعر و سخن سے میرا مقصد محض شاعری نہیں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ: ع ''سوئے قطاری کشم ناقۂ بے زمام را!'' بڑی پیاری تشبیہ ہے۔ ایک قافلہ تھا' جو ایک منزل کی طرف گامزن تھا'

اُس کی اونٹنیاں منتشر ہو گئیں' جس کا جدھر منہ اٹھا چل پڑی' قافلہ درہم برہم ہو گیا۔ مقصود اس سب سے یہ ہے کہ پھر وہ قافلہ وجود میں آئے اور اپنی منزل کی سمت میں اپنے سفر کا آغاز کر سکے۔ معلوم ہو کہ اس قافلے کی منزل کون سی ہے تاکہ قدم سے قدم ملا کر یہ اُمت اس کی طرف بڑھ سکے۔

اُمتِ مسلمہ کی تاریخ کی اساس و بنیاد

ہماری تاریخ' اگر اسے تاریخِ اسلام کہا جائے' اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ نوعِ انسانی کی تاریخ۔ کچھ لوگوں کے ذہنوں میں یہ مغالطہ ہے کہ اسلام کا آغاز نبی اکرم ﷺ سے ہوا۔ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ اسلام کی تاریخ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے' اس لیے کہ از روئے قرآن پہلا انسان پہلا نبی بھی تھا۔ تو گویا تاریخِ نبوت تاریخِ آدمیت ہے اور اس کو آپ چاہیں تو تاریخِ اسلام کہہ لیں۔ سب انبیاء کا ایک ہی دین تھا۔ سورۃ الشوریٰ کی اس آیت میں اسی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾

(الشوریٰ:۱۳)

''(اے مسلمانو!) تمہارے لیے ہم نے وہی دین معین کیا ہے جس کی وصیت ہم نے نوحؑ کو کی تھی اور جسے (اے محمد ﷺ) اب آپ کی طرف ہم نے بذریعہ وحی بھیجا ہے' اور جس کا حکم ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو کر چکے ہیں' اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ!''

یہ ایک ہی دین ہے اور تمہارا فرض یہ ہے کہ اِس دین کو قائم کرو' قائم رکھو اور اس کے بارے میں آپس میں تفرقے میں مبتلا مت ہو جاؤ۔ تو دین ایک ہی ہے ''دین اسلام''۔

تاریخِ اسلام کا آغاز یوں تو حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا' اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تاریخِ نبوت ہی تاریخِ آدمیت ہے۔ البتہ اُمتِ مسلمہ کی تاریخ کا آغاز حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے ہوتا ہے۔ چنانچہ اس اُمت کی تاریخ کو نبی اکرم ﷺ کی سیرت کے تناظر

میں ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کا ایک پس منظر ہے' اگر اس کو صحیح طور پر نہ سمجھا جائے تو اس اُمت کی تاریخ کا صحیح فہم حاصل نہیں کیا جاسکتا اور آپ اس کے مختلف اَدوار کا تعین نہیں کر سکتے کہ اُن کا کیا مقام اور کیا مرتبہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ایک مشہور قول اکثر خطباتِ جمعہ میں نقل ہوتا ہے:

((خَيْرُ أُمَّتِيْ [وَفِيْ رِوَايَةٍ : خَيْرُ النَّاسِ] قَرْنِيْ ' ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ' ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ))(۱)

''میری اُمت کے بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں' پھر وہ لوگ جو اس سے متصل ہوں گے' پھر وہ جو اس سے متصل ہوں گے۔''

اس کا تعین دراصل نبی اکرم ﷺ کے مشن اور آپ ؐ کے مقصدِ بعثت کے اعتبار سے ہوتا ہے' اس لیے کہ خیر القرون یعنی دَورِ نبویؐ کے بعد دَورِ خلافتِ راشدہ ہے۔ دَورِ خلافتِ راشدہ کا اصل مقام و مرتبہ کس اعتبار سے ہے' اس کی اصل فضیلت کی بنا کیا ہے' نبی اکرم ﷺ کے مشن میں اس کا کردار (role) اور اس کا حصہ (contribution) کیا ہے' اس کو صرف اُس وقت سمجھا جاسکتا ہے جبکہ خود نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کو سمجھ لیا جائے۔

مسلمانوں کی تاریخ کسی ایک قوم کی تاریخ نہیں ہے' اس میں بہت سی اقوام کی تاریخ شامل ہے۔ اگر لفظ قوم ہی استعمال کرنا ہے تو عربوں کی تاریخ اس کا ایک جزو ہے' ترکانِ سلجوقی کی تاریخ اس کا ایک جزو ہے' ترکانِ عثمانی کی تاریخ اس کا ایک جزو ہے' ترکانِ تیموری کی تاریخ اس کا ایک جزو ہے' بربروں کی تاریخ اس کا ایک جزو ہے۔ بہت سی اقوام کی تاریخ مل کر مسلمانوں کی تاریخ بنتی ہے۔ لیکن جب آپ اُمت مسلمہ کی تاریخ کو سمجھنا چاہیں گے تو اس کو اسی حوالے سے سمجھا جاسکے گا کہ اس اُمت کی غرضِ تأسیس کیا تھی' اس کو برپا کس لیے کیا گیا' اس کا اجتماعی نصب العین کیا تھا اور اس حوالے

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب المناقب' باب فضائل اصحاب النبی ﷺ ۔ وصحیح مسلم' کتاب فضائل الصحابة ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم۔ عن عمران بن حصین ؓ وعن عبداللّٰه بن مسعود ؓ۔

سے اس کی تاریخ کے اَدوار کون کون سے ہیں۔ مختلف قوموں کا عروج وزوال اپنی جگہ پر' سوال یہ ہے کہ اُس مشن کا کیا معاملہ ہوا جو محمد عربی ﷺ اپنی اُمت کے حوالے کر کے گئے تھے' اور پھر اس کے حوالے سے معین کیا جائے کہ آج ہم کہاں کھڑے ہیں۔ ہمارے مسائل گوناگوں ہیں' متنوع ہیں' طرح طرح کے ہیں۔ لیکن اصل مسئلہ وہ ہے' جیسے کہ حدیث میں الفاظ آئے ہیں: ((مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَاحِدًا هَمَّ آخِرَتِهٖ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ))(۱) ''جو شخص اپنے تمام تفکرات کو ایک فکر میں گم کر دے' یعنی اپنی آخرت کی فکر' اللہ تعالیٰ اُس کے تمام دُنیوی تفکرات کو دُور فرما دے گا''۔ اس کی ساری ضروریات کی کفالت وہ خود فرمائے گا۔ اسی طرح اُمت کے مسائل بہت ہیں' لیکن ان میں جو اصل مسئلہ ہے پہلے اس کا شعور ہو' اس کا تعین ہو' اس کو سمجھا جائے اور یہ بات سامنے آ جائے کہ بقیہ سارے مسائل اسی ایک مسئلے میں گم ہو سکتے ہیں' بلکہ یہ سب مسائل پیدا ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ اس ایک مسئلے سے اغماض برتا گیا ہے' اس کو ترک کیا گیا ہے۔ اگر یہ بات سامنے آئے تو یہ ہے درحقیقت تاریخ کے مطالعہ کا کوئی فائدہ۔ مَیں اس سلسلۂ تقاریر میں کوشش کروں گا کہ ان ہی مسائل پر اس خاص پس منظر میں اپنے خیالات کا اظہار کروں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا' ہمارے نزدیک تو پوری تاریخ انسانی بھی تاریخ نبوت ہے' اور پھر مسلمانوں کی تاریخ کی اساس و بنیاد تو سیرتِ محمد یہ ﷺ ہے۔ تو سب سے پہلے ہم یہ سمجھیں گے کہ از روئے قرآن بعثتِ انبیاء کا مقصد اور سلسلۂ رسالت کی غرض و غایت کیا ہے۔ اس کے بعد اِن شاء اللہ اس پر گفتگو ہو گی کہ نبوت و رسالت کا حضرت محمد ﷺ پر جو اتمام و اکمال ہوا ہے جس کے نتیجے میں ختمِ نبوت واقع ہوئی' اس کے کیا لوازم ہیں' کیا نتائج ہیں اور اس کی کیا implications ہیں۔ پھر اِن شاء اللہ سیرت النبی ﷺ کا واقعاتی انداز میں بیان ہو گا۔ پھر اس کے پس منظر میں خلافتِ راشدہ کا اور پھر تاریخ اُمتِ محمد ﷺ کا بیان ہو گا۔

(۱) سنن ابن ماجه' المقدمة' باب الانتفاع بالعلم والعمل به۔ عن عبدالله بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

منصبِ رسالت

آج کے موضوع کے ضمن میں پہلے یہ بات سمجھ لیجیے کہ نبوت اور رسالت دو الفاظ بھی ہیں' دو اصطلاحات بھی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا ایک جداگانہ مفہوم بھی ہے' لیکن میری آج کی گفتگو کے اعتبار سے یہ دونوں الفاظ مترادف یا ہم معنی الفاظ کی حیثیت سے سامنے آئیں گے۔ ہمارے ہاں یہ ایک بڑا علمی مسئلہ رہا ہے کہ آیا نبوت و رسالت بالکل ہم معنی الفاظ ہیں یا ان کے مفہوم مختلف ہیں ـــــ اور اگر ان میں کوئی فرق اور امتیاز ہے تو کس بنیاد پر؟ اس بارے میں میری بھی ایک رائے ہے جو میں مختلف اوقات پر ظاہر کرتا رہا ہوں۔ اجمالاً یہ کہ نبوت ایک ذاتی حیثیت اور ایک ذاتی مرتبہ ہے جبکہ رسالت ایک فرضِ منصبی ہے۔ اس کی وضاحت میں ایک سادہ سی مثال سے یوں کیا کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں خصوصی تربیت یافتہ افراد پر مشتمل ایک C.S.P کاڈر (cadre) ہے۔ جو اس کو qualify کر لیتے ہیں وہ اس خاص سطح اور مرتبہ پر آ جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ڈپٹی کمشنر لگا دیا جاتا ہے اور کسی کی سیکرٹری کی ذمہ داری تفویض کی جاتی ہے' لیکن اس کا معین کاڈر (C.S.P) برقرار رہتا ہے۔ اس اعتبار سے نبوت ایک مرتبہ ہے اور رسالت وہ منصب ہے جب ایک نبی کو معیّن طور پر کسی قوم کی طرف بھیجا گیا۔ ذاتی حیثیت میں وہ نبی ہے اور اس منصب کے لحاظ سے وہ رسول ہے۔ یہ بات تو ہمارے ہاں مجمع علیہ ہے کہ ہر رسول لازماً نبی بھی ہوتا ہے' مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ ایک نبی ذاتی حیثیت میں تو نبی ہے' لیکن جب اس کا تعین ہو گیا (مثلاً: اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ) تو اب وہ رسول ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ﴿رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا﴾ ''اور ہم نے قوم مدین کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا''۔ سورۃ الاحزاب کی اس آیت میں ان دونوں الفاظ (نبی اور رسول) کو کیسے سمو دیا گیا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝﴾

''اے نبیؐ! ہم نے بھیجا ہے آپ کو گواہ بنا کر' بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر' اللہ کی اجازت سے اُس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر''۔

یعنی ذاتی حیثیت میں نبی اور بھیجے جانے کی حیثیت میں رسول۔ یہاں پر یہ فرق ذہن میں رکھئے کہ بقیہ تمام رسول کسی معین قوم کی طرف بھیجے گئے جبکہ محمد رسول اللہ ﷺ کو پوری نوعِ انسانی کی جانب مبعوث فرمایا گیا اور قرآن میں اس کے بارے میں صراحت فرما دی گئی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾(سبا:۲۸) ''اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر''۔

ایمانیاتِ ثلاثہ میں ایمان بالرسالت کا مقام

مرتبۂ نبوت اپنی جگہ پر ایک مستقل اور بڑا طویل مضمون ہے۔ مراتبِ چہارگانہ یعنی انبیاءؑ' صدیقین' شہداء اور صالحین میں سب سے اونچا مرتبہ نبوت کا ہے۔ میری آج کی گفتگو درحقیقت منصبِ رسالت سے متعلق ہے۔ اس کی غرض و غایت کیا ہے' اس کو سمجھنے کے لیے پہلے ایمان باللہ' ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت کے مابین منطقی ربط و تعلق کو سمجھنا ضروری ہے۔ ایمان بالرسالت اس کُل کا ایک جزو ہے اور تینوں اجزاء باہم مربوط ہیں' ان کا بڑا گہرا ربط ہے۔

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا نتیجہ جو نکلتا ہے اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ حیاتِ انسانی کے بارے میں ان دونوں کو جمع کرنے سے ایک بات متعین ہوتی ہے' اسے نظریۂ حیات کہہ لیں' نظریۂ زندگی کہہ لیں' کہ انسانی زندگی صرف پچاس ساٹھ سال کا عرصہ نہیں ہے' بلکہ یہ ایک بڑا طویل سفر ہے ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں' پیہم دواں' ہر دم جواں ہے زندگی!

اصل زندگی تو موت کے بعد کی ہے۔ یہ ہے اصل میں انقلابی نتیجہ جو ایمان پر مترتب ہوتا ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ (العنکبوت) ''اصل زندگی کا گھر تو آخرت کا ہے' کاش انہیں معلوم ہوتا''۔ اس سے زندگی کے تصور میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ ایک شخص کے نزدیک اصل زندگی یہی ہے' یعنی پیدائش سے لے کر موت تک' جبکہ ایک کے نزدیک یہ تو کتابِ زندگی کا دیباچہ ہے' مقدمہ ہے' تمہید ہے' اور اصل زندگی موت کے بعد ہے۔ اب جو اصل زندگی ہے ﴿وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى﴾ (الاعلیٰ) اس کا کُل دار و مدار اسی نظریے پر ہے۔ انسان وہاں عافیت میں رہے گا یا تکلیف میں رہے گا' ﴿فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ وَّجَنَّةُ نَعِيْمٍ﴾ اس کے نصیب بنیں گے یا ﴿تَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ﴾ (الواقعة) اس کا انجام بنے گا۔ ابدالآباد تک کی راحت یا ہمیشہ ہمیش کے لیے عذاب' اس کا فیصلہ یومِ آخرت کو ہوگا۔ چنانچہ ایمانیات میں مرکزی اور محوری (pivotal) حیثیت ایمان بالآخرۃ کو حاصل ہے۔ ''ایمان مُفصّل'' کے الفاظ ہیں: آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ۔ اس یومِ آخر کا محاسبہ ہی فیصلہ کن ہے۔ جو اُس روز کامیاب ہوا وہ کامیاب اور جو اُس روز ناکام ہوا وہ ناکام اور تباہ و برباد قرار پائے گا۔ سورۃ التغابن (آیت ۹) میں فرمایا: ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۭ﴾ (وہی ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا دن!) اب آپ سوچئے ایمان اگر واقعتاً قلب و ذہن میں شعوری سطح پر کچھ بھی جگہ بنا لے تو انسان کی سوچ کس قدر بدل جائے گی! اس کی اقدار (values) بدل جائیں گی' نقطۂ نظر بدل جائے گا۔ اصل فیصلہ کن چیز یہی ایمان بالآخرۃ ہے۔

یہ فیصلہ کہ کون جیتا کون ہارا' کون کامیاب رہا اور کون ناکام' اُسی دن ہوگا۔ لیکن اس دن کے محاسبے کی بنیاد کیا ہے؟ فلسفۂ رسالت کو سمجھنے کے لیے یہ سمجھ لینا ضروری ہے۔ دیکھئے' امتحان لیا جاتا ہے کچھ پڑھا کر' حساب لیا جاتا ہے کچھ دے کر۔ یہ جو محاسبہ ہے جس کی رو سے یہ زندگی ایک امتحانی وقفہ بن گئی ہے۔

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اِس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

اِس امتحان کی بنیاد کیا ہے' محاسبۂ اُخروی کی اساس کیا ہے؟ قرآن مجید ان موضوعات پر روشنی ڈالتا ہے' یہ بنیادی باتیں ہیں۔ فرمایا:

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝۲﴾ (الدھر)

''ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا' تا کہ اسے آزمائیں' پس ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا ہے۔''

فَجَعَلْنٰهُ میں کلمہ فاء (پس) بہت اہم ہے۔ جب امتحان لینا ہے تو کچھ صلاحیتیں دی ہیں' ذمہ داری ڈالی ہے تو کچھ استعداد بھی پیدا کی ہے' مسئول بنایا ہے تو کچھ دے کر بنایا ہے۔ فرمایا ہم نے اسے سمیع اور بصیر بنایا ہے' سماعت اور بصارت دے کر بھیجا ہے' عقل اور شعور کی قوتیں دے کر بھیجا ہے' اور اس سے بھی آگے بڑھ کر خیر و شر کی معرفت اور تمیز دے کر بھیجا ہے' انسان اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اسے بتائے کہ یہ نیکی ہے اور یہ بدی ہے۔ سورۃ الشمس میں فرمایا:

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾

''قسم ہے نفسِ انسانی کی اور جو اسے ہموار کیا (اس کی نوک پلک سنواری)۔ پھر اُس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اُس پر الہام کر دی۔''

اسے فجور اور تقویٰ کا علم الہامی طور پر دیا گیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بدی کیا ہے اور نیکی کیا ہے' شر کیا ہے اور خیر کیا ہے۔ انسان اندھا بہرہ نہیں ہے کہ بغیر کوئی امداد دیے اسے امتحان کی بھٹی میں جھونک دیا گیا ہو۔ ایسا ہوتا تو یہ ظلم ہوتا۔ انسان کے اندر کچھ داعیاتِ شر بھی ہیں: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ لیکن اس کے اندر وہ روحِ ملکوتی بھی ہے جو اسے نیکی اور خیر کی طرف کھینچتی ہے۔ جہاں نفسِ امارہ اسے پستی کی طرف' عالمِ سفلی کی طرف' برائی کی طرف کھینچنے والا ہے' وہیں روحِ ملکوتی اُسے عالمِ علوی اور عالمِ ملکوت کی طرف پرواز کرنے کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ اسی طرح یہ بات تو بہت معلوم و معروف ہے' کون مسلمان

نہیں جانتا ہوگا کہ خارج میں کچھ غیر مرئی قوتیں بھی ہیں جو انسان کو شر کی طرف بلانے والی ہیں۔ جنات ہیں، خصوصاً اُن کا گروابلیسِ لعین ہے، جو شر کی طرف بلانے والا، برائی کو مزیّن کر کے دکھانے والا، بے حیائی کی رغبت دلانے والا، نفرتیں اور کدورتیں پیدا کرنے والا ہے۔ اس کے بارے میں قرآن حکیم میں بار بار متنبہ کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر فرمایا:

﴿اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ﴾ (المائدۃ:۹۱)

''شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے۔''

ایک جگہ ارشاد ہوا:

﴿اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ﴾ (البقرۃ:۲۶۸)

''شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔''

سورۃ الاعراف میں فرمایا:

﴿اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾ (آیت ۲۷)

''وہ اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔''

وہ اور اس کی صُلبی اور معنوی ذریت تم پر حملہ کرتے ہیں اور تمہارے لیے گھات میں بیٹھتے ہیں، جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھتے۔ اسی طرح غیر مرئی قوتیں خیر کی بھی موجود ہیں۔ یہ حقیقت اس دَور میں کچھ عقلیت پسندی (rationalism) اور کچھ سائنسی طرزِ فکر کی وجہ سے نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے، لیکن یہ بہت بڑی حقیقت ہے۔ ملائکہ ہیں جو خیر کی طرف بلاتے ہیں۔ یہ نیکوں کی پیٹھ ٹھونکنے والے، انہیں شاباش دینے والے اور ان کی تثبیتِ قلبی کا ذریعہ بننے والے ہیں۔ جیسا کہ غزوۂ بدر کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا: ﴿فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (الانفال:۱۲) ''پس تم اہلِ ایمان کے پاؤں جما دو''۔ اور پاؤں تبھی جمتے ہیں جب دل جما ہوا ہو۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں اہلِ ایمان پر

ملائکہ کے نزول کا ذکر اِن الفاظ میں ہوا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾

''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا ربّ اللہ ہے' پھر اس پر جم گئے' اترتے ہیں ان پر فرشتے (یہ کہتے ہوئے) کہ نہ غم کھاؤ اور نہ خوف' اور بشارت حاصل کرو اُس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔''

یوں سمجھئے ایک جنگ ہے خیر و شر کے درمیان' انسان کے اندر بھی اور خارج میں بھی۔ اندر خیر کی طاقت بھی ہے اور شر کی بھی' باہر بھی داعیانِ خیر بھی ہیں اور داعیانِ شر بھی۔ گویا بڑی ہی متوازن قسم کی قوتیں ہیں جو ایک دوسرے کو balance کر رہی ہیں۔

رسولوں کی بعثت کا مقصد: شہادت علی الناس

ان حالات میں جبکہ شر کی طاقت موجود ہے تو خیر کی طاقت بھی ہے' انسان کو سماعت اور بصارت بھی دی گئی ہے' عقل و شعور کی قوتیں بھی عطا کی گئی ہیں اور نیکی اور بدی کی تمیز بھی عطا کی گئی ہے' ہر انسان ان بدیہیاتِ فطرت کی بنیاد پر اپنی جگہ مسئول ہے' ذمہ دار ہے' جواب دہ ہے' خواہ کوئی نبی آتا یا نہ آتا' کوئی وحی نازل ہوتی یا نہ ہوتی' کسی رسول کو بھیجا جاتا یا نہ بھیجا جاتا۔ انسان مسئول ہے اُن استعدادات کی بنا پر جو قدرت نے اس کے اندر ودیعت کی ہیں۔ یہاں وہ اشکال حل ہو جاتا ہے جو بعض حضرات کو پیش آتا ہے کہ جن لوگوں تک کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی ان کا محاسبہ کیسے ہوگا؟ عدل کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے داعیاتِ خیر و شر انسان کے اندر رکھ دیے۔ اب وہ ذمہ دار ہے' جدھر جا رہا ہے اس کا بدلہ اسے مل کر رہے گا' سزا ہو یا جزا ہو۔ اس کے بعد انسان پر کوئی اور ہدایت' کوئی نبوت' کوئی رسالت' کوئی وحی عدل کا تقاضا نہیں۔ البتہ رحمتِ خداوندی متقاضی تھی کہ مزید رہنمائی کے لیے رسالت و نبوت کا سلسلہ جاری کیا جاتا۔ اس اعتبار سے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ (الحج)

نبوت و رسالت درحقیقت رحمتِ خداوندی کا مظہر ہے' عدلِ خداوندی کا نہیں۔

عدلِ خداوندی تو اس اعتبار سے بھی مکمل ہے کہ انسان کو امتحان میں ڈالا ہے تو نہتا نہیں ڈالا' غیر مسلّح نہیں ڈالا' بغیر کچھ دیے اس آزمائش میں مبتلا نہیں کیا' بلکہ یہ سب کچھ دے کر بھیجا ہے۔ انبیاء و رُسلؑ کی بعثت تو درحقیقت قطع عذر اور اتمامِ حجت کے لیے ہوتی ہے' تاکہ انسان کے پاس اپنی غلط روی کے لیے کوئی حجت' کوئی بہانہ' کوئی دلیل باقی نہ رہے۔ اس ضمن میں سورۃ النساء کی آیات ۱۶۳ تا ۱۶۵ بڑی اہم ہیں کہ اس مقام پر انبیاء و رُسل کا نام بنام ذکر کیا گیا اور اس کے بعد فرمایا:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۱۶۵﴾

''ان رسولوں کو ہم نے بھیجا خوشخبری دینے والے اور خبردار کرنے والے بنا کر تاکہ ان رسولوں کی بعثت کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے' اور اللہ تو غالب رہنے والا حکیم و دانا ہے۔''

یہ دونوں الفاظ (مبشر اور منذر) قرآن مجید میں رسولوں کے بارے میں بکثرت آئے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کر کے فرمایا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝۱۰۵﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ہم نے تو آپ کو بھیجا ہی مبشر اور منذر بنا کر ہے''۔ سورۃ الکہف میں اس کو جمع کے صیغے میں لائے: ﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ﴾ (آیت ۵۶) ''اور نہیں بھیجتے ہم رسولوں کو مگر بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر۔''

سورۃ النساء کی متذکرہ بالا آیت میں رسولوں کو مبشّر اور منذر بنا کر بھیجے جانے کی غرض و غایت یہ بیان کی گئی: ﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ﴾ ''تاکہ نہ رہ جائے لوگوں کے حق میں اللہ کے مقابلے میں کوئی دلیل (کوئی بہانہ' کوئی عذر) رسولوں کی بعثت کے بعد''۔ عربی زبان میں ''ل'' اور ''علٰی'' کا استعمال ایک دوسرے کی ضد کے طور پر ہوتا ہے۔ ایک حجت' ایک دلیل کسی کے حق میں ہے تو کسی کے خلاف ہے۔ جیسے ایک شہادت' ایک گواہی کسی مقدمے کے فریقین میں سے کسی کے حق

میں جائے گی تو کسی کے خلاف جائے گی۔ جس کے حق میں ہوگی اس کے لیے ''ل'' اور جس کے خلاف ہوگی اس کے لیے ''علٰی'' کا حرف آئے گا۔ یہاں حجت کے ساتھ دونوں حرف اکٹھے آ گئے ہیں' جیسے ایک حدیث میں بھی دونوں آتے ہیں: ((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ اَوْ عَلَيْكَ)) (۱) ''قرآن یا تو حجت ہے تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف''۔ اس کو اپنا امام اور رہنما بناؤ گے تو یہ تمہارے حق میں دلیل ہوگا۔ لیکن اگر اس کے حقوق ادا نہیں کرو گے' یا اس کو پڑھنے اور سمجھنے کے باوجود غلط راستے پر چلو گے تو یہ تمہارے خلاف دلیل ہوگا۔ اسی طرح یہاں فرمایا کہ ان رسولوں کو ہم نے مبشر اور منذر بنا کر بھیجا ''تاکہ نہ رہ جائے لوگوں کے حق میں' لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی دلیل۔'' یعنی لوگ اللہ کے حضور پیشی کے وقت یہ عذر پیش نہ کر سکیں کہ اے اللہ! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تو چاہتا کیا ہے۔ اے اللہ! ہم تو نہیں جانتے تھے کہ یہ چیز تو نے حرام کی ہے۔ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٦٥﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ عزیز (یعنی زبردست) بھی ہے (اور) حکیم بھی ہے''۔ وہ زبردست ہے' مختارِ مطلق ہے' جیسے چاہے محاسبہ کرے' جیسے چاہے پرسش کرے کوئی اس پر اعتراض نہیں کر سکتا' لیکن وہ حکیم بھی ہے۔ اُس نے محاسبے کے لیے جو بنیادیں معین کی ہیں وہ اس کی حکمت پر مبنی ہیں۔

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾ کے الفاظ کا فلسفۂ نبوت و رسالت کے ساتھ بڑا گہرا ربط ہے۔ قرآن کے نزدیک انسانی ارادہ (human will) آزاد ہے۔ ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾ کے مصداق چاہے تو انسان شکر گزاری کی راہ اختیار کرے' فرماں برداری کی روش اپنائے' اور چاہے تو کفرانِ نعمت کا رویہ اختیار کرے' سرکشی اور بغاوت کی راہ پر چلے' دونوں راستے کھلے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اصل چیز انسان کا فیصلہ ہے۔ کوئی چیز بھی ثانوی درجے میں خیر یا شر کے لیے مؤید ہو سکتی ہے۔ انسان کے لیے کسی پہلو سے بھی نہ کسی داعیٔ شر کو اور نہ کسی داعیٔ خیر کو کوئی اختیار حاصل ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے

(۱) صحیح مسلم' کتاب الطهارة' باب فضل الوضوء۔ وسنن الترمذی' کتاب الدعوات عن رسول اللہ ﷺ۔

شیطانِ لعین کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ۝۴۲﴾ (الحجر)

''میرے بندوں پر تجھے کوئی اختیار نہیں' سوائے اس کے جو تیرا اتباع کرے اور جو بہکے ہوئے لوگوں میں سے ہو۔''

جن کی سوچ اور طلب خود کج ہو چکی ہو اور وہ تیرا اتباع کریں' انہیں تو تو جہاں چاہے لے جا' جس کھائی میں چاہے لے جا کر گرا دے' لیکن میرے بندوں پر جو میرے راستے پر چلنا چاہیں تجھے کوئی اختیار نہیں۔

یوں سمجھئے کہ خارج کے داعیانِ شر میں سب سے بڑا ابلیسِ لعین ہے' اور خارج کے داعیانِ خیر میں جو شخصیت اتمامِ حجت کے درجے میں رسالت و نبوت کے منصب پر اپنے معیارِ کمال کو پہنچی وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیتِ مبارکہ ہے۔ اُن کو بھی صاف صاف بتا دیا گیا کہ:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ﴾ (القصص:۵۶)

''(اے نبی ﷺ!) آپ کو اختیار نہیں ہے کہ آپ جسے چاہیں ہدایت دے دیں' یہ تو اللہ ہی ہے جو ہدایت دے سکتا ہے جس کو چاہے!''

اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت کا ایک ضابطہ بنایا ہوا ہے کہ جو ہدایت کا طالب ہوتا ہے اسے ہدایت دیتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت:۶۹) ''اور جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے ہم انہیں اپنے راستے دکھا کر رہیں گے''۔ زبردستی وہ کسی کو ہدایت نہیں دیتا۔ جیسے فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝۵﴾ (القصص) ''یقیناً اللہ تعالیٰ ناانصافوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا''۔

اب رہا ایمان باللہ' ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرۃ کا باہمی ربط و تعلق' تو رسالت اصل میں اتمامِ حجت اور قطعِ عذر کے لیے ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا' انسان بذاتہٖ (as such) مسئول ہے' جواب دہ ہے' ذمہ دار ہے ان استعدادات کی بنیاد پر جو اسے ودیعت کی گئی ہیں' جن سے مسلح کر کے اسے اس امتحان میں ڈالا گیا ہے۔ لیکن

رحمتِ خداوندی کا تقاضا ہوا کہ اس پر مزید اتمامِ حجت کر دیا جائے' حق کو واضح کر دیا جائے۔ انبیاء و رُسل فطرت کے براہین و دلائل سے اور کلامِ الٰہی کے نور سے لوگوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالیں' اُجالے میں لائیں' حق کی راہ روشن اور اُجاگر کریں۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس کا ایک عملی نمونہ پیش کریں۔ اس لیے کہ ایک حجت علمی بھی ہوتی ہے۔ آپ نے ایک بات کو دلائل سے ثابت کر دیا تو حجت قائم ہوگئی۔ لیکن یہ حجت ان لوگوں پر قائم ہوئی جن کی علمی سطح بلند ہے' جو اس دلیل کی value پر' اس کی بنیاد پر سمجھ پائیں۔ اس کے بعد نوعِ انسانی کی ایک بڑی وسیع تعداد وہ ہوگی جو شاید اس علمی سطح پر بات کو نہ سمجھ سکے۔ لیکن ان لوگوں کے سامنے اس کا کوئی عملی نتیجہ پیش کر دیا جائے تو وہ سمجھ سکیں گے' بات واضح ہو جائے گی۔

قرآنی اصطلاح ''شہادت'' کا اصل مفہوم

انبیائے کرام حق کی دعوت اپنے قول سے دیتے تھے اور اُس کا نمونہ اپنے عمل سے پیش کرتے تھے۔ اور یہ نمونہ انفرادی سطح پر بھی تھا اور اجتماعی سطح پر بھی۔ اس دعوت اور اس کے عملی نمونے کے لیے قرآن مجید کی اصطلاح ''شہادت'' ہے۔ اس لفظ کو آپ ذرا اچھی طرح سمجھئے۔ ہمارے ہاں یہ لفظ اللہ کے راستے میں جان قربان کر دینے کے مفہوم میں بکثرت استعمال ہوتا ہے' لیکن قرآن مجید کی رُو سے ''شہادت'' کا لفظ انبیاءِ کرام علیہم السلام کے فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لیے آتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ یہ لفظ صراحتاً مقتول فی سبیل اللہ کے معنی میں پورے قرآن میں نہیں آیا' ماسوائے سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴۰ کے' کہ جہاں یہ لفظ مقتول کے معنی میں استعمال ہوا ہے: ﴿وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ﴾۔ قرآن مجید میں اللہ کی راہ میں قتل ہونے کا مضمون بار بار آیا ہے' لیکن وہاں لفظ شہادت یا شہید نہیں آیا۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں انہیں مُردہ نہ کہو' بلکہ وہ تو درحقیقت زندہ

ہیں' مگر تم (ان کی زندگی کا) شعور نہیں رکھتے۔''

اسی بات کو سورۂ آل عمران میں پھر دہرایا گیا:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں انہیں مردہ گمان مت کرو' بلکہ وہ تو درحقیقت زندہ ہیں' اپنے ربّ کے ہاں رزق دیے جاتے ہیں۔''

سورۂ آل عمران ہی میں محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں فرمایا:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَاۗىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓي اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ﴾

''محمد (ﷺ) اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں' اُن سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو کوئی اُلٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا۔ اور اللہ شکر گزار بندوں کو بدلہ دے گا۔''

یہاں بھی اسی قتل فی سبیل اللہ کا ذکر ہے۔ سورۃ التوبۃ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ﴾ (آیت ۱۱۱) ''وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں' پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔'' دیکھ لیجیے' کہیں بھی لفظ شہید یا شہادت نہیں ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کی ایک خواہش کا اظہار اس طرح ہوتا ہے:

((لَوَدِدْتُ اَنِّيْ اُقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلُ))(۱)

(۱) صحیح البخاری' کتاب التمنی' باب ما جاء فی التمنی ومن تمنی الشهادة' وکتاب الجهاد' باب تمنی الشهادة۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب فضل الجهاد والخروج فی سبیل اللّٰه۔

''میری بڑی ہی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں' پھر مجھے زندہ کر دیا جائے' پھر اللہ کی راہ میں قتل ہو جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر اللہ کی راہ میں قتل ہو جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں۔''

رسول اللہ ﷺ نے یہاں چار مرتبہ اللہ کی راہ میں قتل ہونے کی آرزو کا اظہار کیا ہے' مگر لفظ شہید استعمال نہیں فرمایا۔ لفظ شہید جو قرآن میں آیا ہے وہ اس مضمون کی وضاحت کے لیے آیا ہے جو میں نے ابھی بیان کیا ہے' یعنی خلقِ خدا پر اتمامِ حجت کر دینا' یہ ہے اصل شہادت۔ اللہ کی طرف سے گواہی دے دینا' حق کی گواہی' صداقت کی گواہی' توحید کی گواہی' رسالت کی گواہی' بعث بعد الموت کی گواہی' جزاء وسزا کی گواہی' جنت و دوزخ کی حقانیت کی گواہی۔ یہ وہ گواہی ہے جس کا دینے والا درحقیقت اللہ کا گواہ ہے اور یہ وہ گواہی ہے جس کے لیے اللہ کے رسول مبعوث ہوئے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ اکیلا ہے' اس کا کوئی شریک نہیں''۔ یہ شہادت قول سے ہوئی۔ اور اگر اس کی شہادت آپ نے اپنی زندگی میں دے دی تو یہ عملی گواہی ہے' جو یقیناً ایک بڑا مشکل کام ہے' بقول اقبال مرحوم ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را!

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا آسان اور اس کی گواہی عملاً دینا بہت مشکل ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا اور جرم کیا تھا؟ یہی گواہی کہ اَحد' اَحد' اَحد! ورنہ نہ تو چوری کی تھی نہ ڈاکہ ڈالا تھا۔ اسی گواہی کی پاداش میں اوندھے منہ سنگلاخ زمین پر جب کہ سورج نصف النہار پر چمک رہا ہوتا تھا' انہیں گھسیٹا جاتا تھا' مگر وہ پھر بھی یہ پکارتے چلے جاتے تھے کہ اَحد' اَحد' اَحد۔ جب نبی اپنی دعوت سے' اپنے قول سے' اپنے عمل سے اللہ کی توحید و وحدانیت کی گواہی' آخرت کی گواہی' حق وصداقت کی گواہی' عدل وانصاف کی گواہی دے دیتا ہے تو گویا اُس نے نسل انسانی پر حجت قائم کر دی' اور اس کے لیے اب لفظِ شہادت کا اطلاق ہوتا ہے۔ سورۃ المزمل میں ارشاد ہوا:

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿١٥﴾﴾

''(اے مسلمانو!) ہم نے بھیج دیا ہے تمہاری طرف ایک رسول تم پر اپنا گواہ بنا کر' جیسے کہ ہم نے بھیجا تھا فرعون کی طرف ایک رسول (یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام)۔''

یہی لفظ شاہد سورۃ الاحزاب میں بھی آیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿٤٥﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿٤٦﴾﴾

''اے نبی! ہم نے بھیجا ہے آپ کو شاہد بنا کر' مبشر بنا کر' نذیر بنا کر اور اللہ کی طرف بلانے والا بنا کر اُس کے حکم سے اور (ہدایت کا) ایک روشن چراغ بنا کر!''

ان تمام حیثیتوں میں مقدم اور اہم ترین لفظ شہادت ہے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں رسولوں کی بعثت اسی شہادت کے لیے ہے۔ اس کا ظہور قیامت میں ہوگا جب اُمتوں کی جواب دہی ہوگی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عدالتِ اُخروی میں ایک محاسبہ اجتماعی سطح پر ہوگا جب اُمتوں کے معاملات طے ہوں گے۔ اس کو آپ اجتماعی محاسبہ (collective accountability) کہہ لیجیے۔ اس کے بعد وہ مرحلہ آئے گا جب ہر ہر شخص کو جواب دہی کرنی ہوگی۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿٩٥﴾﴾ (مریم)۔ جب محاسبہ اُمتوں کی سطح پر ہوگا اُس کا نقشہ قرآن حکیم میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿٤١﴾﴾ (النساء)

''(اے نبی ﷺ!) پس کیسا ہوگا اُس دن (کیا ہوگا اُس دن' کیا بنے گی اُس دن) جبکہ ہم ہر ہر اُمت پر ایک گواہ کھڑا کریں گے اور آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے ان کے خلاف!''

گواہ کس معنی میں؟ کہ آپ نے ان پر اتمامِ حجت کر دیا ہے' اور روزِ محشر آپ اللہ تعالیٰ کے حضور گواہی دیں گے کہ اے اللہ! تیرا دین' تیری ہدایت جو مجھ تک پہنچی تھی میں نے

بلاکم و کاست ان کے سامنے پیش کر دی' اب یہ خود جواب دہ اور مسئول ہیں' اپنے طرزِ عمل کے پورے طور پر ذمہ دار ہیں' یہ لاعلمی کا بہانہ نہیں بنا سکتے۔ یہ گواہی اُمت کے خلاف پڑنے والی ہے۔ اس دَور کی مروّجہ اصطلاحات میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انبیاء ورُسل سرکاری گواہ (prosecution witnesses) کی حیثیت سے پیش ہوں گے۔ مشہور واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمائش کی کہ مجھے قرآن سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا حضور! آپ کو سناؤں؟ آپ پر تو قرآن نازل ہوا ہے! آپؐ نے فرمایا: ہاں! مجھے دوسروں سے سن کر کچھ اور لطف آتا ہے۔ امتثالِ امر میں انہوں نے سورۃ النساء پڑھنی شروع کی۔ وہ نگاہیں نیچے کیے ہوئے پڑھ رہے تھے اور آنحضور ﷺ سن رہے تھے' جب اس آیت پر پہنچے: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝۴۱﴾ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((حَسْبُكَ حَسْبُكَ)) (بس کرو' بس کرو) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ مَیں نے جو نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو نبی اکرم ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

رسولوں کے باب میں اللہ کی سنت

فلسفۂ رسالت کے اعتبار سے یہ مسئلہ بھی اہم ہے کہ رسول کے آنے کے بعد چونکہ حجت آخری درجے میں قائم ہو جاتی تھی' لہٰذا جس قوم کے پاس رسول بھیج دیا جاتا تھا اب اُس کو کوئی رعایت نہیں دی جاتی تھی۔ اس کے لیے رسول گویا آخری عدالت کا فیصلہ بن کر آتا تھا۔ جب تک رسول نہیں آیا قوم کے پاس کوئی عذر باقی ہے' لیکن رسول کے آنے کے بعد' ہدایت کے اس طرح مبرہن ہو جانے کے بعد' حق کے اس طرح منکشف ہو جانے کے بعد' قولاً اور عملاً حجت قائم ہو چکنے کے بعد اب بھی اگر کوئی قوم اپنے کفر اور اپنے انکار پر اَڑی ہوئی ہے تو اب وہ کسی رعایت کی مستحق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسولوں کے باب میں اللہ کی سنت یہ رہی ہے کہ جس قوم کی طرف رسول بھیج دیا گیا اور اس کے باوجود وہ کفر پر' شرک پر' کج روی پر اَڑی رہی تو اس کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ ان کے انجام کو قرآن مجید کہیں یوں تعبیر کرتا ہے: ﴿كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا﴾ (ھود:۹۵) ''وہ ایسے

ہو گئے گویا کبھی وہاں تھے ہی نہیں''۔ کہیں الفاظ آتے ہیں: ﴿لَا يُرٰى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ﴾ (الاحقاف:۲۵) ''اب نہیں دکھائی دیتے مگر ان کے مسکن!'' مکین نہیں رہے' صرف مکان رہ گئے کھنڈرات کی شکل میں' جو اپنے رہنے والوں کی عبرت ناک داستان سنا رہے ہیں۔ قومِ نوحؑ پر' قومِ ہودؑ پر' قومِ صالحؑ پر' قومِ لوطؑ پر' قومِ شعیبؑ پر اور آلِ فرعون پر اللہ تعالیٰ کی اسی سنت اور اسی قانون کے تحت عذابِ استیصال آیا۔

یہ معاملہ ایک اعتبار سے بڑا اہم ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام بھی رسول تھے۔ قرآن مجید میں صاف لکھا ہے: ﴿وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ (آل عمران:۴۹)۔ میں نے ابتدا میں نبوت و رسالت کا جو فرق عرض کیا تھا اُس اعتبار سے نبی کے لیے یہ شرط لازم نہیں ہے کہ وہ ضرور غالب ہو کر رہے' نبی مغلوب بھی ہو سکتا ہے' قتل بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے حضرت یحییٰ علیہ السلام قتل ہو گئے۔ جبکہ رسول کبھی مغلوب نہیں ہوتا' وہ تو اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہوتا ہے۔ نبیؑ نبی ہونے کی حیثیت سے اپنا ایک رتبہ رکھتا ہے جو بہت بلند رتبہ ہے' لیکن اس کے معاملے میں اللہ کا وہ قانون نہیں ہے جو رسولوں کے معاملے میں ہے۔ بنی اسرائیل کے وہ جرائم جن کی پاداش میں ان پر ذلت و مسکنت مسلّط کی گئی اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ٹھہرے' ان میں انبیاء کرام علیہم السلام کا قتل بھی شامل ہے: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (البقرۃ:۶۱) ''یہ اس لیے ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے''۔ لیکن رسولوں کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے: ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ﴾ (المجادلۃ:۲۱) ''اللہ نے لکھ دیا ہے کہ مَیں اور میرے رسول لازماً غالب آ کر رہیں گے''۔ چنانچہ رسول قتل نہیں ہو سکتا' اس لیے کہ وہ مغلوب نہیں ہو سکتا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے یہی تو فریاد کی تھی کہ: ﴿اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ﴾ (القمر) ''اے اللہ! میں تو مغلوب ہوا چاہتا ہوں' پس تو مدد فرما!'' پھر اللہ کی مدد آئی تو پوری قوم کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ ایک اور مقام پر رسولوں کے باب میں اللہ تعالیٰ کا قانون و ضابطہ بایں الفاظ بیان ہوا ہے:

﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٧١﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿١٧٢﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿١٧٣﴾﴾ (الصّٰفّٰت)

''اور گزر چکا ہے ہمارا یہ حکم ہمارے اُن بندوں کے بارے میں جنہیں ہم نے رسول بنا کر بھیجا' کہ یقیناً اُن کی مدد کی جائے گی' اور یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا۔''

چنانچہ رسولوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ آتے ہیں تو قوم کے لیے عدالت بن کر آتے ہیں۔ قوم انکار کرتی ہے تو اس کو نیست و نابود کر دیا جاتا ہے اور رسول غالب رہتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں اگر یہ نہ مانا جائے کہ ان کو دوبارہ دنیا میں آنا ہے' جسے ''عقیدۂ نزولِ مسیح'' کہا جاتا ہے' تو یہ قانون ٹوٹتا ہے۔ وہ تو پھر مغلوب ہوئے اور جس قوم کی طرف انہیں بھیجا گیا وہ اپنے کفر کے باوجود نیست و نابود نہیں ہوئی۔ کفر بھی کیسا کفر کہ اللہ کے جلیل القدر پیغمبر کو انہوں نے کافر' مرتد اور جادوگر کہا' اور اپنی حد تک تو سولی پر چڑھا کر دم لیا' اور پھر بھی وہ قوم دنیا میں موجود ہے! اللہ کا یہ قانون اٹل ہے' درحقیقت اس کو ابھی پورا ہونا ہے۔ صرف یوں کہیے کہ وہ محفوظ فیصلہ (reserved judgement) ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں چند صدیوں کی مدت کوئی بڑی طویل مدت نہیں۔ وہ فیصلہ نافذ ہوگا اور یہودی اسی رسول کے ہاتھوں ہلاک و برباد ہوں گے۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟

یہ تو ہمارے ہاں ایک جھوٹی نبوت کے لیے راستہ ہموار کرنے کے لیے ایک شوشہ چھوڑا گیا تھا۔ حقیقت یہی ہے کہ کوئی مثیلِ مسیح نہیں' عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام خود آئیں گے' اور یہ قانون متقاضی ہے کہ اُنہی کے ہاتھوں یہودیوں کو سزا ملے۔ احادیث نبویؐ میں خود حضرت مسیحؑ کے ہاتھوں یہودیوں کو ملنے والی سزا کی تصریح ملتی ہے اور ان یہودیوں کا جو آخری انجام ہے' جس کیفر کردار کو یہ دنیا میں پہنچیں گے اس کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے۔ ہر وہ پتھر جس کے پیچھے کوئی یہودی چھپے گا وہ پکار کر کہے گا: ''اے روح اللہ! یہ یہودی ہے جو

میرے پیچھے چھپا ہوا ہے'' اور حضرت مسیح مقامِ لُد پر دجال کو قتل کریں گے۔ یہ وہی لیڈا (Lydda) ہے جو اسرائیل کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ ہے۔ حدیث میں اس کے لیے لفظ ''لُد'' آیا ہے۔ دجالِ اکبر وہاں سے بھاگنے کی فکر میں ہوگا اور حضرت مسیحؑ اس کو ماردیں گے۔ بہرحال یہ ایک علمی مسئلہ تھا اور میں نے چاہا کہ نبوت و رسالت کی جو بحث آج آئی ہے اس کے حوالے سے اس کو بھی واضح کردوں۔

رسول اللہ ﷺ پر نبوت و رسالت کا اتمام و تکمیل

اب لوٹیے اصل مضمون کی طرف! قافلۂ نبوت و رسالت چلتا رہا' اللہ کے رسول آتے رہے' قوموں پر حجت قائم کرتے رہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے نزدیک تاریخ نبوت' تاریخ آدمیت ہے۔ چنانچہ قافلۂ انسانیت بھی چلتا رہا اور شعور و تمدن کی منزلیں طے کرتا رہا۔ یہ بات اگرچہ صد فیصد درست ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نبوت ختم ہوگئی' اس میں کوئی شک نہیں' لیکن اس کا ایک اہم تر پہلو ہے' اور بدقسمتی سے اس کی طرف توجہ نہیں کی جاتی' کہ نبوت و رسالت کا نبی اکرم ﷺ پر صرف خاتمہ نہیں ہوا' بلکہ اتمام ہوا ہے' تکمیل ہوئی ہے۔ کسی شے کا مجرد ختم ہو جانا باعث فضیلت نہیں ہے۔ بلکہ اس پر تو منطقی طور پر اعتراض بھی وارد ہوسکتا ہے کہ ایک فضیلت تھی جس کو ختم کر دیا گیا' ایک سلسلۂ فیض تھا جو بند ہوگیا۔ اس لیے نبوت و رسالت کا معاملہ صرف ختم نہیں بلکہ اپنے اتمام اور اکمال کو پہنچنے کے بعد ختم ہوا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾ (المائدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کردی۔''

یہ دونوں الفاظ (اِکمال اور اِتمام) قرآن مجید کے ہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ نے جو تشبیہ دی ہے وہ آپ کے علم میں ہوگی کہ میری ختم نبوت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بہت بڑا محل تعمیر کیا گیا' اس میں ایک جگہ کوئی رخنہ تھا' لوگ دیکھتے تھے اور سوچتے تھے کہ اس عمارت میں یہ خلا کیوں چھوڑ دیا گیا؟ میرے آنے سے وہ خلا پُر ہوگیا اور قصرِ نبوت مکمل

ہوگیا' رسالت کی عمارت اپنے تکمیلی مرحلے کو پہنچ گئی۔

نبوت و رسالت کے اتمام و تکمیل کے دو پہلو بڑے اہم ہیں۔ قافلۂ نبوت کے ساتھ چلتے چلتے قافلۂ انسانیت نے دو اعتبارات سے عہدِ طفولیت سے نکل کر عہدِ بلوغت میں قدم رکھا۔ ایک طرف عقلی و فکری اعتبار سے۔ انبیاء کا معاملہ ایک طرف رکھئے' ان کو اللہ تعالیٰ جو شعور یعنی شعورِ نبوت عطا کرتا ہے وہ ایک استثنائی (exceptional) چیز ہے۔ شعورِ نبوت وہبی ہے' کسبی نہیں ہے۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام کو پورا شعور عطا کیا گیا تو اس میں کوئی تعجب والی بات نہیں ہے۔ یہ اس قاعدۂ کلیہ سے صرف ایک استثنائی صورت ہے۔ بحیثیت مجموعی اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نسل انسانی نے عقلی بلوغ کے لیے منزلیں طے کی ہیں۔ دوسری طرف انسان نے اجتماعیت اور تمدن کا سفر طے کیا ہے' مل جل کر رہنے کا نظام بنایا ہے اور اس کے بھی تدریجی مراحل ہیں۔ سوچ' فکر' عقل کا بھی ارتقائی سفر ہے اور اجتماعیت' تہذیب اور تمدن کا بھی ایک سفر ہے جو قافلۂ انسانی طے کر رہا ہے۔ آج سے چودہ سو برس قبل وہ وقت آیا کہ محمدِ عربی ﷺ کی بعثت ہوئی۔ ایک سوال یہاں پیدا ہوسکتا ہے ـــــ اور آپ کو معلوم ہے کہ سوال پیدا ہوتے ہیں تو علم آگے بڑھتا ہے۔ سوچ تب ترقی کرتی ہے جب سوال سامنے آتا ہے۔ کوئی سوال ہی نہ ہو تو فہم میں' قوتِ نظری اور قوتِ فکری میں کوئی ترقی نہیں ہوتی۔ وہ سوال یہ ہے کہ کیا سبب ہے کہ یہی وقت منتخب کیا گیا آخری اور کامل نبوت و رسالت کے لیے؟ آج سے چودہ سو برس قبل کا وقت کیوں مقرر کیا گیا؟ ایک ہزار سال پہلے یا ایک ہزار سال بعد کا کیوں نہیں؟ اللہ کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں' فِعْلُ الْحَكِيْمِ لَا يَخْلُوْ عَنِ الْحِكْمَةِ۔ سوال سامنے رکھئے اور جواب تلاش کیجیے! شاید حکمتِ خداوندی سے کچھ حصہ میسر آجائے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کا مذاہب و فلسفہ دونوں کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ اچانک میرے سامنے ایک بڑی اہم بات بیان کی اور میں نے ان کو توجہ دلائی کہ اس بات کا تعلق براہِ راست ختمِ نبوت سے ہے۔ انہوں نے کہا کہ تاریخ

انسانی کے بارہ تیرہ سو سال اس اعتبار سے بڑے اہم ہیں کہ انسان نے حقیقتِ نفس الامری تک رسائی کے لیے جو بھی سعی و کوشش کی ہے' سوچا ہے' غور و فکر کیا ہے' اسی عرصے میں کیا ہے' جس کے نتیجے میں مذاہب پیدا ہوئے' مکاتب فلسفہ وجود میں آئے۔ یہ ۶۰۰ یا ۷۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۶۰۰ بعد مسیح تک کا زمانہ ہے' جب یونان' ہندوستان' چین اور ایران میں غور و فکر جاری رہا ہے۔ ویسے تو انسانی تہذیب و تمدن کے اعتبار سے مصر کا بھی ایک مقام ہے' لیکن جسے واقعتاً سوچ اور فکر کا نام دیا جا سکے' اُس کے دنیا میں یہ چار ہی مراکز ہیں۔ یعنی یونان' ایران' ہندوستان اور چین۔ یہیں مذاہب پیدا ہوئے' فلسفے پیدا ہوئے۔ چشتی صاحب کا کہنا ہے کہ ان بارہ تیرہ سو برس میں ہر اعتبار سے انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا اُس نے سوچ لیا اور اس کے بعد کوئی نیا زاویۂ نگاہ' کوئی نیا فکر بالکل وجود میں نہیں آیا۔ یہ جو یورپ کی جدید فلاسفی ہے یہ قدیم افکار و نظریات کی صرف صدائے بازگشت ہے۔ وہی پرانے فلسفے اور وہی نظریات ہیں' ان کو انسان دوبارہ کھنگال رہا ہے اور انہیں نئے لیبلوں کے ساتھ پیش کر رہا ہے۔ فلسفہ مکمل ہو چکا تھا جبکہ محمد عربی ﷺ تشریف لائے۔ گویا اب وہ وقت آ چکا تھا کہ انسان کو وہ آخری ہدایت نامہ دے دیا جائے' کیونکہ وہ سب کچھ سوچ چکا تھا' انسان میں جس قدر بھی صلاحیت بحیثیت انسان تھی وہ بروئے کار آ چکی تھی۔ اب اس کے فکر و عمل کے لیے آخری اور کامل ہدایت نامہ عطا کر دیا گیا۔

ایک دوسرے پہلو سے بھی نوعِ انسانی نے اجتماعیت کی طرف سفر کی متعدد منزلیں طے کر لی تھیں۔ انسان کبھی قبیلوں کی شکل میں رہتا تھا۔ اُس دور کو چھوڑیے جب ابھی قبیلوں کی شکل بھی نہ تھی۔ اجتماعیت کا نقطۂ آغاز قبائلی نظام (Tribal System) ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے ہاں اب تک وہ نظام موجود ہے اور ہمارے زیر انتظام اب تک وہ علاقے ہیں جہاں سب سے بڑا سیاسی مسئلہ یہ ہے کہ وہاں کا نظام ابھی تک اسی قبائلی نظام کے تحت قائم ہے۔ یہ انسانی اجتماعیت کی سب سے ابتدائی صورت ہے۔ قبیلہ ایک مکمل سیاسی یونٹ بھی ہے' مکمل معاشرتی یونٹ بھی ہے اور ایک معاشی یونٹ بھی

ہے۔ گویا کُل اجتماعیت انسانیہ نے ایک قبیلہ کی شکل اور ہیئت اختیار کر لی ہے۔ اس سے آگے چلیے! کچھ قبیلوں نے مل جل کر ایک شہر میں رہنا شروع کیا تو شہری ریاستیں وجود میں آئیں۔ یہاں یہ نکتہ ذہن میں رہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت مکہ مکرمہ قبیلے کی سطح پر زندگی بسر کر رہا تھا' جہاں صرف ایک قبیلہ آباد تھا۔ مدینہ منورہ اس سے اگلے قدم پر تھا' یہ ایک شہری ریاست تھی۔ وہاں پانچ قبیلے آباد تھے اور ان کے آپس کے معاملات طے کرنے کے لیے اصول معین تھے۔ یوں کہہ لیجیے کہ ابتدائی صورت میں ایک دستور موجود تھا' چاہے وہ لکھا ہوا نہ ہو۔ تحریر شدہ دساتیر تو اب بھی دنیا کی کئی بڑی بڑی مملکتوں کے ہاں بھی نہیں ہیں۔

جس وقت رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی دنیا میں دو عظیم مملکتیں قائم تھیں' یعنی سلطنتِ فارس اور سلطنتِ روما۔ یہ گویا آپس میں جھولا جھولتی رہتی تھیں۔ کبھی ایک کو عروج حاصل ہوتا تو کبھی دوسری کو۔ مغربی ایشیا' شام' فلسطین اور ترکی کا علاقہ کبھی اِدھر ہوتا تھا تو کبھی اُدھر۔ سورۃ الروم کے آغاز میں سلطنتِ روما کے مغلوب ہو جانے کے بعد دوبارہ غلبے کی پیشین گوئی کی گئی: ﴿الٓمّٓ ① غُلِبَتِ الرُّوْمُ ② فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ③﴾ ان کے درمیان یہ معاملہ رہتا تھا کہ کبھی یہ آگے بڑھے تو وہ پیچھے ہٹ گئے' کبھی وہ آگے بڑھے تو یہ پیچھے ہٹ گئے۔ یہ دو عظیم مملکتیں' دو عظیم سلطنتیں کئی سو برس تک دنیا میں قائم رہیں۔ یہاں بھی اجتماعیت انسانی نے وہاں تک سفر طے کر لیا تھا۔ اس کے بعد انسانیت نے صرف ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے اور یہ ہے تصورِ ریاست (concept of state)۔ اسے قبائلی نظام سے ایک قدم آگے کہا جا سکتا ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ جب آنحضور ﷺ کی بعثت ہوئی اُس وقت تہذیب و تمدن اور اجتماعیتِ انسانیہ اس سطح پر پہنچ چکے تھے کہ گویا ایک جدید دَور کا آغاز ہونے والا تھا' جبکہ اجتماعیت کی گرفت انسان کی زندگی پر فیصلہ کن ہو چکی تھی۔ انفرادیت کی جگہ اجتماعیت لے چکی تھی۔ اُس وقت بعثت ہوئی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی' تاکہ نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت ہو سکے۔

منصبِ رسالت کا اصلی بنیادی مقصد وہی شہادت علی الناس ہے' جس کے لیے تمام رسول مبعوث ہوئے۔ بنیادی طور پر محمد رسول اللہ کا مقصدِ بعثت بھی وہی ہے' لیکن اس کی جہات (dimensions) بدل رہی ہیں۔ کیونکہ انسان عہدِ طفولیت سے قدم نکال کر بلوغت اور پختگی کی عمر میں قدم رکھ چکا ہے۔ قافلۂ انسانیت ابتدائی منزلیں طے کر کے اب اس دورِ جدید میں قدم رکھ چکا ہے۔ اس وقت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی اِتمامِ رسالت' تکمیلِ نبوت اور ختمِ نبوت کے ساتھ۔ اس اتمامِ رسالت' تکمیلِ نبوت اور ختمِ نبوت کے لوازم پر اِن شاء اللہ تعالیٰ آئندہ نشست میں گفتگو ہوگی۔ مزید یہ کہ اس سطح پر اتمامِ حجت کے لیے نبی اکرم ﷺ نے جس طرح محنت اور جدوجہد کی اور اس نظامِ اجتماعی کا نقشہ پیش کیا اور پھر اس نظامِ اجتماعی کے نقشے کو عملاً قائم کر کے نوعِ انسانی پر ہمیشہ ہمیش کے لیے اتمامِ حجت کر دیا' یہ سب کچھ اِن شاء اللہ میری آئندہ کی گفتگو کا موضوع ہوگا۔

اقولی قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

سلسلۂ خُطبات ②

تکمیلِ رسالت اور اُس کے لوازم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ۙ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ۝﴾(التوبۃ:۳۳، الصف:۹) ..... ﷺ

گزشتہ مباحث کا خلاصہ

سیرۃ النبی ﷺ اور تاریخ اسلام کے موضوع پر سلسلۂ تقاریر کے ضمن میں یہ دوسری نشست ہے۔ پہلی نشست میں ہم نے منصبِ رسالت اور اُس کا مقصد سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اس ضمن میں جو کچھ عرض کیا گیا اس کا خلاصہ ذہن میں مستحضر کر لیجیے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ ''ایمان'' جس کی بنیاد پر اسلام کا پورا قصر تعمیر ہوتا ہے' اُس کا حاصل اور لُبِّ لُباب یہ ہے کہ انسانی زندگی اصل میں وہ ہے جو موت کے بعد شروع ہوگی۔ یہ زندگی جسے دُنیوی زندگی کہنا چاہیے' اُس اصل کتابِ زندگی کے صرف دیباچے اور مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی اصل حیثیت ایک امتحانی وقفے کی ہے۔ اس امتحان کے نتیجے کا اعلان یومِ آخر کو ہوگا اور پھر اس نتیجے کا ظہور پوری ابدی زندگی میں جاری رہے گا۔

دوسری بات یہ کہ اس محاسبۂ اُخروی کی اوّلین اساس وہ استعداداتِ فطری ہیں جو انسان میں ودیعت کی گئی ہیں' اور وہ ہیں سماعت' بصارت' عقل وشعور اور نیکی و بدی کی تمیز۔ یہ تو بنیادی استعدادات ہیں جن سے مسلّح ہو کر انسان اس دار الامتحان میں وارد ہوا۔ اس سے آگے بڑھیے تو آئینۂ قلب ہے جو آئینۂ جہاں نما ہے۔ اس میں معرفتِ

ربانی بھی موجود ہے اور محبتِ خداوندی کی آگ بھی سینے میں سلگتی رہتی ہے۔ انسان میں روحِ ربانی بھی ہے جس کی وجہ سے اس کا رجحان عالمِ علوی یا عالمِ ملکوت کی طرف رہتا ہے۔ مغربی مفکرین نے بھی انسانی شخصیت کے اس پہلو کا مشاہدہ کیا اور اسے Divine Spark سے تعبیر کیا' جسے ہم ''شعلۂ ملکوتی'' کا نام دے سکتے ہیں۔ اقبالؔ کہتا ہے:۔

ہے ذوقِ تجلّی بھی اِسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ اِدراک نہیں ہے!

انسان کو صرف حواسِ خمسہ دے کر نہیں بھیجا گیا' اور بھی بہت سی استعدادات ہیں جو اس میں ودیعت کی گئیں۔ ان کی بنیاد پر ہر انسان اس امتحان میں مبتلا کیا گیا ہے' وہ مسئول ہے' جواب دہ (accountable) ہے' مکلف ہے۔

تیسری بات جو عرض کی گئی' یہ تھی کہ نبوت و رسالت کا سلسلہ رحمتِ خداوندی کا مظہر ہے۔ انسان اگرچہ مسئول اپنی فطری استعدادات کی بنیاد پر ہے' لیکن رحمتِ خداوندی نے نبوت و رسالت' وحی اور انزالِ کتب کا سلسلہ انسان کی ان فطری استعدادات کو تقویت پہنچانے کے لیے جاری کیا۔ اس کے قلب میں نورِ معرفت موجود ہے' لیکن وہ دھندلا جاتا ہے' اس پر غبار آ جاتا ہے اور آئینۂ قلب مکدر ہو جاتا ہے۔ رحمتِ خداوندی متقاضی ہوئی کہ انسان کے آئینۂ قلب کو منوّر کرنے کے لیے اس پر نورِ وحی اتارا جائے۔

تخلیق کے متعلق ایک بڑا پیارا شعر ہے:۔

من نہ کردم خلق تا سُودے کنم
بلکہ تا بر بندگاں جُودے کنم!

سلسلۂ خلق بھی رحمتِ خداوندی کا مظہر ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی مزید رحمت نبوت و رسالت' انزالِ وحی اور بعثتِ انبیاءؑ کی شکل میں ہوئی تاکہ ان استعداداتِ فطری کو تقویت حاصل ہو۔ اس کا حاصل سورۃ النساء کی آیت ۱۶۵ کی روشنی میں عرض کیا جا چکا ہے کہ رسولوں کو مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا گیا تاکہ انسان کے پاس اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کوئی حجت' کوئی عذر' کوئی بہانہ یا کوئی دلیل باقی نہ رہ جائے۔ اسے قطع حجت سے بھی تعبیر کیا جا

سکتا ہے اور اتمامِ حجت سے بھی۔ اس نورِ وحی کے بعد' بعثتِ انبیاءؑ کے بعد' ارسالِ رُسلؑ کے بعد' انزالِ کتب کے بعد اب کسی کے پاس اپنی غلط روی کے لیے کوئی عذر موجود نہیں۔ چنانچہ انبیاء و رُسل علیہم السلام اُمتوں کے محاسبے کے وقت قیامت کے دن عدالتِ اُخروی میں سرکاری گواہوں کی حیثیت سے پیش ہوں گے۔ وہ گواہی دیں گے کہ اے اللہ! تیری ہدایت جو ہم تک پہنچی ہم نے بلاکم وکاست ان تک پہنچادی۔

اس کے دو نتیجے نکلتے ہیں۔ ایک تو میں عرض کر چکا ہوں کہ رسولوں کی آمد کے بعد نہ صرف یہ کہ آخرت میں انسان کے پاس کوئی عذر نہیں رہے گا' بلکہ اس دنیا میں بھی جس قوم کی طرف رسول کو بھیج دیا جائے اس کو پھر کوئی رعایت نہیں دی جاتی' اس کا فیصلہ چکا دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ رسول کی آمد کے بعد بھی کوئی قوم اپنی کج روی پر مصر رہے' اپنی غلط روی پر اڑی رہے' اپنے کفر اور شرک کے اوپر قائم رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب اس میں خیر کا کوئی پہلو باقی نہیں رہا۔ اب یہ خس وخاشاک کی مانند ہے۔ یہ زمین کی پیٹھ کا بوجھ ہے جس سے اس کو نجات دلا دینے ہی میں عافیت ہے۔ چنانچہ رسولوں کی بعثت کے بعد اگر کوئی قوم اعراض وانکار پر اڑی رہی تو اس پر عذابِ استیصال آیا جس سے وہ قوم نیست ونابود کر دی گئی۔ چنانچہ قومِ نوحؑ' قومِ ہودؑ' قومِ صالحؑ' قومِ شعیبؑ' قومِ لوطؑ اور آلِ فرعون کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا ہے کہ یہ سب قومیں نیست ونابود کر دی گئیں۔

اس کا ایک اور نتیجہ بھی ہے' اسے بھی ذہن نشین کر لیجیے۔ چونکہ بعثتِ رُسلؑ سے مقصود ہے اتمامِ حجت' لہٰذا رسولوں کے باب میں اللہ کی سنت یہ قرار پائی کہ ہر قوم میں اُسی میں سے کسی کو رسول بنا کر کھڑا کیا جائے' تاکہ کوئی اجنبیت کا پردہ اور مغائرت کا حجاب درمیان میں حائل نہ رہے۔ اس بنا پر انسانوں کے پاس انسان ہی رسول بنا کر بھیجے گئے اور اکثر و بیشتر اُسی قوم کے افراد ہی کو بھیجا گیا' از روئے الفاظِ قرآنی: وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ..... وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صَالِحًا ..... وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ..... استثناءات تو کوئی ہوں گی' لیکن قانون یہی ہے کہ اُسی قوم کا کوئی فرد ہو' جس کی زندگی اُن کی نگاہوں کے سامنے گزر رہی ہو' اس کی سیرت وکردار' اس کی امانت وصداقت کے

وہ خود گواہ ہوں اور وہ اُن ہی کی زبان بولتا ہوا آئے۔ گویا اتمامِ حجت بتمام و کمال ہو جائے۔ یہ ہے بعثتِ رُسلؑ سے اصل مقصود۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا ''تاریخِ اسلام'' کا دراصل آغاز ہوتا ہے حضرت آدم علیہ السلام سے۔ وہ پہلے انسان بھی ہیں اور پہلے نبی بھی۔ چنانچہ تاریخِ انسانیت اور تاریخِ نبوت بالکل متوازی ہیں۔ قافلۂ انسانیت بھی ارتقائی منازل طے کرتا رہا اور نبوت نے بھی ارتقائی منازل طے کیں۔ البتہ میں عرض کر چکا ہوں کہ جہاں تک نبی کے اپنے ذاتی شعور کا تعلق ہے وہ وہبی ہوتا ہے' اکتسابی نہیں ہوتا۔ ذاتی طور پر حضرت آدم علیہ السلام کا شعور مکمل تھا' لیکن بحیثیتِ مجموعی نسلِ آدم نے ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پر عہدِ طفولیت بھی آیا ہے' عقل و شعور کی پختگی کا دَور بھی آیا ہے اور اس کی نسبت سے وحی نازل ہوتی رہی ہے' کتابیں اترتی رہی ہیں۔ تاہم شرائع میں فرق ہوتا رہا ہے' تفصیلی احکام بدلتے رہے ہیں۔ ایک طرف قافلۂ انسانیت ارتقائی مراحل طے کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ قافلۂ نبوت بھی ارتقائی مراحل سے گزر رہا تھا' تا آنکہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نبوت اپنے کمال کو پہنچ گئی' رسالت اپنے تکمیلی مرحلے تک پہنچ گئی۔ نتیجتاً نبوت ختم ہو گئی۔ میں یہ بات بتکرار و اعادہ عرض کر رہا ہوں کہ ختمِ نبوت اپنی جگہ اٹل ہے' مگر اس کا اہم تر پہلو اتمامِ نبوت اور تکمیلِ رسالت ہے جو حضرت محمد ﷺ پر ہوئی۔

سیرت کے فہم میں اپنوں اور غیروں کی کوتاہی

آج سب سے پہلے تو میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس اتمامِ نبوت اور تکمیلِ رسالت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے سیرتِ محمدی ﷺ کے فہم میں اپنوں نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں اور دوسروں نے بھی بڑی زبردست غلطیاں کی ہیں۔ میں دوسروں کا ذکر پہلے کر رہا ہوں جنہوں نے اس معاملے میں بڑی کوتاہ نظری کا ثبوت دیا ہے۔ ٹائن بی (۱۸۸۹ء تا ۱۹۷۵ء) دَورِ حاضر کا ایک اہم تاریخ نگار ہے اور فلسفۂ تاریخ کے حوالے سے اس کا ایک مسلّمہ مقام ہے۔ اس شخص نے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ایک بڑا زہر آلود جملہ کہا تھا اور یہ ایک جملہ ایک پوری ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے:

"Muhammad failed as a prophet but succeeded as a stastesman."

''محمد (ﷺ) ایک نبی کی حیثیت سے تو ناکام ہو گئے' لیکن ایک مدبر اور سیاست دان کی حیثیت سے کامیاب ہوئے۔''

تنقید کا اصول یہ ہے کہ وہ ہمدردانہ ہونی چاہیے' یعنی جس شخص کی بات پر آپ تنقید کر رہے ہیں پہلے ہمدردی کے ساتھ اس کی بات سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے' پھر جو نقد و جرح آپ کو کرنی ہو کیجیے۔ تو ذرا ہمدردانہ طور پر سمجھئے کہ اس نے کیا کہا ہے' کیا کہنا چاہا ہے' اس کے ذہن کی اصل الجھن کیا ہے! اُس کا جو تصورِ نبوت ہے وہ کیا ہے؟ وہ عیسائی ہے' اور انسان خواہ کتنا ہی ملحد ہو جائے مذہبی روایات اس کا ساتھ نہیں چھوڑا کرتیں' وہ انسان کے فکر کے اندر رچی بسی ہوتی ہیں۔ بہرحال وہ عیسائی ہے' اس نے تورات پڑھی ہے' انجیل پڑھی ہے' نبوت کا ایک تصور اس کے ذہن میں بنا ہے۔ اس تصورِ نبوت میں نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ سما نہیں رہی۔ وہ بہت چھوٹا سانچہ ہے۔ اس لیے کہ وہ نبوت کا سانچہ ہے' ختم نبوت کا نہیں ہے' اتمامِ نبوت کا نہیں ہے' تکمیلِ رسالت کا نہیں ہے۔ مستشرقین اس بات سے تولنا چاہ رہے ہیں محمد عربی ﷺ کو کہ جس سے آپ ﷺ کو تولا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا وہ اپنے فہم کے مطابق دیکھتے ہیں تو آنحضور ﷺ کی مکی زندگی تو ان کے نبوت کے سانچے میں فٹ بیٹھتی ہے' جہاں دعوت ہے' تبلیغ ہے' وعظ و نصیحت ہے' کچھ حواریین یعنی صحابہؓ ہیں' ان کی تربیت ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کوہِ زیتون پر وعظ فرما رہے ہیں اور نبی اکرم ﷺ کوہِ صفا پر وعظ فرما رہے ہیں۔ چنانچہ انہیں مطابقت نظر آتی ہے۔ حضرت مسیحؑ کے ساتھ چلتے پھرتے حواری ہیں' شام یہاں' صبح وہاں۔ یہاں بیت ارقم ہے' تعلیم و تربیت کا ایک مرکز ہے۔ اگر حضرت مسیحؑ کو ستایا جا رہا ہے تو یہاں نبی اکرم ﷺ کو بھی ستایا جا رہا ہے اور وہ بھی اپنے ستانے والوں کو دعائیں دے رہے ہیں۔ یہاں تک تو بات ان کی سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن اس کے بعد جو مدنی دَور ہے وہ ان کے کسی سانچے میں فٹ نہیں بیٹھتا۔

ان کے ہاں انبیاء کا جو نقشہ ہے وہ ذہن میں رکھیے۔ عیسائیوں کے لیے نبوت

کا آئیڈیل حضرت یحییٰ علیہ السلام ہیں۔ یہ مَیں نے اس لیے کہا کہ حضرت مسیح علیہ السلام تو ان کے نزدیک نبی سے برتر کچھ اور شے ہیں۔ اگرچہ عیسائیوں میں بھی ایک قلیل طبقہ موحدین کا رہا ہے۔ اب بھی Jehovah's Witnesses کے نام سے کچھ لوگ موجود ہیں جو تثلیث کے قائل نہیں ہیں اور حضرت مسیحؑ کو صرف رسول مانتے ہیں۔ تو ان میں سے عام لوگوں کے اعتبار سے حضرت یحییٰ علیہ السلام اور ان موحدین کے اعتبار سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبوت کا کامل نمونہ ہیں' اور ان دونوں کی زندگی میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی کی کوئی جھلک انہیں نظر نہیں آتی۔ انہیں آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مکی دَور تو اس کے مطابق نظر آتا ہے اور یہاں ان کے قول کے مطابق' آپؐ ناکام ہو گئے اور مکہ سے نکلنا پڑا۔ چنانچہ اس نے لکھ دیا کہ آپؐ بحیثیتِ نبی ناکام ہو گئے۔ (معاذ اللہ!)

لیکن محمد عربی ﷺ کے مدینے میں آنے کے بعد انہیں یہ نظر آتا ہے کہ یہاں آپؐ کی ایک بالکل دوسری شان ہے۔ اب آپؐ ایک statesman ہیں' ایک مدبر ہیں' ایک سیاست دان ہیں' ایک سپہ سالار ہیں۔ یہ حیثیتیں ہیں محمد رسول اللہ ﷺ کی جو نمایاں ہو کر سامنے آ رہی ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے ٹائن بی کا کہنا ہے کہ آپؐ کامیاب ہو گئے۔

برطانوی پروفیسر منٹگمری واٹ (۱۹۰۹ء تا ۲۰۰۶ء) نے سیرت النبی ﷺ پر دو کتابیں لکھیں:

1- *Muhammad at Mecca (1953)*
2- *Muhammad at Medina (1956)*

اس کے بعد اس نے ان دونوں کتابوں کا لُبِّ لُباب اپنی کتاب "Muhammad: Prophet and Statesman" کی صورت میں پیش کیا۔ (ہمارے ہاں اس مصنف کو ضیاء الحق صاحب نے سرکاری سطح پر منائی جانے والی سیرت کانفرنس میں بطورِ خاص بلایا تھا)۔ منٹگمری واٹ کی کتابوں کے عنوانات ہی سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے ذہن میں وہی تخصیص ہے کہ محمد ایک نہیں ہے' دو محمد ہیں (ﷺ)۔ یا یوں کہہ لیجیے (نعوذ باللہ من ذلك) یہ ایک انسان کے دو چہرے اور دو روپ ہیں اور اس نے ان کا فرق (contrast) نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے کچھ نیک دل اور سادہ لوح لوگ

ان تعریفوں پر خوش ہو جاتے ہیں جو اُس نے آنحضور ﷺ کے تدبّر، دُور اندیشی اور معاملہ فہمی پر کیں۔ حالانکہ اس کی کتابوں میں زہر چھپا ہوا ہے، اور وہ یہ ہے کہ محمد (ﷺ) اگر قابل تعریف ہیں تو بحیثیت مدبّر ہیں، بحیثیت سیاست دان ہیں، بحیثیت سپہ سالار ہیں، بحیثیت ایک دُور اندیش اور معاملہ فہم انسان ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کی تعریف بحیثیت رسول نہیں ہے۔ یہ اصل میں وہ زہر ہے جو اُس میں پنہاں ہے۔ بہرحال یہ تو وہ ٹھوکریں ہیں جو اوروں نے کھائیں، کچھ جان بوجھ کر بھی کھائیں، کچھ تعصب کے پردے بھی حائل رہے۔

ہمارے ہاں تصویر کا ایک بالکل دوسرا رُخ نظر آتا ہے۔ ہمارے سارے مطالعۂ سیرت، ساری تقاریر سیرت اور محافل میلاد کے سارے بیانات کا حاصل اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ ایک بالکل مافوق الفطرت (super natural) یا مافوق البشر ہستی کا تصور سامنے آتا ہے۔ انسانی سطح (human level) پر نبی اکرم ﷺ کو سمجھنے اور آپؐ کے اصل کارنامے کی عظمت کو جانچنے کی ہمارے ہاں کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ ہماری ایک سیرت کانفرنس میں مفتی محمد حسین صاحب نعیمی نے ایک بہت عمدہ جملہ کہا تھا کہ ''اللہ کی صرف اطاعت ہوگی اور محمد ﷺ کی اطاعت بھی ہوگی، اتباع بھی ہوگا''۔ دیکھئے، کتنی خوبصورتی سے اللہ کی اطاعت اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں فرق واضح کر دیا گیا۔ اللہ جو کچھ کہتا ہے وہ تمہیں کرنا ہے، اور جو کچھ وہ کرتا ہے اسے تم کر ہی نہیں سکتے۔ وہ تو خالق ہے، اس کی شان تو کن فیکون ہے، وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔ تو اس کا اتباع کیسے کرو گے؟ اُس کی تو صرف اطاعت ہے۔ وہ کہتا ہے یہ کرو، وہ کرو، یہ حلال ہے، وہ حرام ہے، مان لیا تو اطاعت ہوگئی۔ مگر نبی اکرم ﷺ کے ساتھ رشتہ جدا ہے۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ بھی کرنا ہے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ بھی کرنا ہے۔ بہت پیاری بات ہے۔ لیکن اس کے لیے لازم ہے کہ سیرت کا وہ نقشہ لوگوں کے سامنے لایا جائے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ کیا انسانی سطح پر کیا۔ ان تمام موانع کے علی الرغم کیا جو کسی بھی انسان کو پیش آ سکتے ہیں۔ ان تمام مصائب اور تکالیف کو جھیل کر کیا جو کسی بھی انقلابی جدّوجہد میں پیش آتے ہیں۔ بقول شاعر: ؎

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری
تنہا پسِ زنداں، کبھی رسوا سرِ بازار

ہمارے ہاں سیرت النبی ﷺ کا بالعموم جو نقشہ پیش کیا جاتا ہے اس میں رسول اللہ ﷺ کو ایک قابل پرستش وجود بنا دیا گیا ہے۔ لیکن وہ نقشہ سامنے نہیں آتا کہ جس سے کوئی درسِ عمل ملے، جس سے کچھ کرنے کا داعیہ پیدا ہو، جس سے آپ ﷺ کے نقشِ قدم کے اتباع کا جذبہ اُبھرے۔ یہ دو انتہائیں ہیں اور ان دونوں کے بین بین ہے سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔

نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

سیرت النبی ﷺ کے صحیح فہم کے لیے سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ کے اصل کارنامۂ حیات کا تعین ضروری ہے۔ اور یہ جان لیجیے کہ جس شخص کے بھی کارنامۂ حیات کو آپ جانچنا (assess کرنا) چاہیں، پہلے معین کرنا ہوگا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ تب ہی تو معلوم ہوگا کہ کس حد تک اس کی تکمیل ہوئی اور کس طرح سے تکمیل ہوئی۔ نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کے ضمن میں قرآن حکیم کی یہ آیت نہایت اہم ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾

اس آیت کے ایک ایک لفظ پر غور کیجیے۔ یہ الفاظ قرآن مجید میں تین مقامات پر جوں کے توں بغیر کسی ایک شوشے کے فرق کے وارد ہوئے ہیں۔ دو مقامات پر اس کے بعد اِن الفاظ کا اضافہ ہے: ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝﴾ (التوبۃ:۳۳ والصف:۹) جبکہ ایک مقام پر الفاظ آتے ہیں: ﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا۝۲۸﴾ (الفتح)

قرآن مجید میں اہم مضامین کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔ متذکرہ بالا الفاظ بعینہٖ بغیر کسی شوشے کے فرق کے قرآن مجید میں تین مرتبہ آئے ہیں۔ ان الفاظ کی اہمیت اسی سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ذخیرۂ الفاظ (vocabulary) کی کمی نہیں اور عربی زبان کا دامن بھی تنگ نہیں۔ اس کے باوجود انہی الفاظ کو تین بار دہرا کر لانا یقیناً ان الفاظ کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔ پھر دوسری حقیقت

یہ ہے کہ یہ الفاظ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے تین دفعہ آئے ہیں' جبکہ کسی دوسرے رسول کے لیے ایک مرتبہ بھی نہیں آئے' بلکہ اس کے آس پاس کے الفاظ بھی نہیں آئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان آیات کا خصوصی تعلق بعثتِ محمدی ﷺ سے ہے۔ رسالتِ محمدیؐ کی غرض وغایت کے لیے یہ الفاظ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'' امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ایک بڑی معرکۃ الآرا کتاب ہے' جس میں شاہ صاحبؒ نے خلافت پر گفتگو کی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے چند آیات کو بعثتِ محمدی ﷺ کے ضمن میں مرکزی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے' ان میں یہ آیت سرفہرست ہے۔ بلکہ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ شاہ صاحب کی تصانیف میں انہیں کسی جگہ یہ جملہ بھی ملا کہ یہ آیت پورے قرآن مجید کا محور اور عمود ہے' اس کو سمجھ کر پڑھیں گے تو قرآن مجید سمجھ میں آئے گا۔ گویا یہ فہم قرآن کے لیے کلید ہے۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ اس آیت کے فہم قرآن کے لیے کلید ہونے میں تو شاید کسی قدر اختلاف کی گنجائش نکل آئے' تاہم سیرتِ محمدی ﷺ کے فہم کے لیے یہ یقیناً محور اور عمود بھی ہے اور کلید بھی۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے اسے اسلام کے عالمی انقلاب کا عنوان قرار دیا ہے۔

اب اس آیت پر غور کیجیے: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ﴾ ''وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو''۔ هُوَ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ سابقہ آیات میں اللہ کا ذکر صراحت سے آیا ہے۔ سورۃ الصف اور سورۃ التوبۃ میں اس سے حصہ پہلے جو آیت ہے اس میں ذرا سا لفظی فرق ہے۔ سورۃ الصف میں الفاظ آئے ہیں:

﴿یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝﴾

''یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ (کی پھونکوں) سے بجھا دیں' جبکہ اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا' خواہ ان کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو!''

اگلی آیت کا مضمون اس سے مربوط ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى﴾ ''وہی

(اللہ) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو''۔ ''رسول'' کوئی مشکل لفظ نہیں ہے۔ اَرْسَلَ یُرْسِلُ اِرْسَالًا کا معنی بھیجنا ہے۔ اردو میں یہ لفظ عام طور پر بولا جاتا ہے' مثلاً خط ارسال کیا' آپ کا مرسلہ ملا' وغیرہ۔ اس سے مفعول مُرْسَلٌ بنتا ہے اور لفظ رسول اس معنی میں صفتِ مُشبّہ ہے۔

ایک بات اور نوٹ کیجیے کہ انبیاء و رُسل میں سے جن کو اولوالعزم کہا گیا ہے وہ خصوصی مرتبے اور شان کی حامل برگزیدہ ہستیاں ہیں' ان کے ساتھ کچھ نسبتیں معروف ہیں' مثلاً آدم صفی اللہ' نوح نجیّ اللہ' ابراہیم خلیل اللہ' اسمٰعیل ذبیح اللہ' موسیٰ کلیم اللہ' عیسیٰ روح اللہ اور محمد رسول اللہ (ﷺ) یعنی جامۂ رسالت بتمام وکمال شخصیتِ محمدی ﷺ پر راست آتا ہے۔ آپؐ کا امتیازی وصف ہی یہ ہے کہ آپ رسول ہیں۔ گویا خلتِ الٰہی اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی حضرت ابراہیم پر (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام)۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے براہِ راست کلام فرمایا: ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾﴾ (النساء) قرآن مجید میں دوسرے انبیاء و رُسل کی عظمت کے جو پہلو ہیں ان کو چھپایا نہیں گیا بلکہ اُجاگر کیا گیا ہے۔ یہ تو ہماری تنگ نظری ہے کہ جب ہم سیرت النبی ﷺ کا بیان کرنے پر آتے ہیں تو اس طور سے کرتے ہیں کہ دوسرے رسولوں کی تنقیص کر گزرتے ہیں' حالانکہ یہ بات تو ہمارے ایمان کا جزو ہے کہ ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ ''ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی ایک کے مابین بھی تفریق نہیں کرتے''۔ اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تواضع کا یہ عالم ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے یونس بن متّٰی پر بھی فضیلت مت دو۔ (۱) انبیاء و رُسل علیہم السلام کی کُل جماعت میں سے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے' حضرت یونس علیہ السلام واحد نبی ہیں جن سے یہ خطا ہوگئی تھی کہ حکم خداوندی کے آنے سے پہلے قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس پر اس دنیا

(۱) عن ابی ہریرة رضی اللّٰه عنه عن النبی ﷺ قال : ((لَا يَنْبَغِیْ لِعَبْدٍ اَنْ يَقُوْلَ اَنَا خَيْرٌ مِنْ يُوْنُسَ بْنِ مَتّٰى)) (صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب قول اللّٰه تعالیٰ: وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ الخ)

میں گرفت ہوئی اور مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ اس کے بعد توبہ کی تو توبہ قبول ہوئی اور انہیں وہاں سے نجات ملی۔

قرآن میں حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے: ﴿وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝﴾ (النساء) ''اور ہم نے داؤد کو زبور دی''۔ ''زبور'' حمدِ الٰہی کے وہ ترانے ہیں جن کی مثل دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ حضرت داؤدؑ جب حمدِ الٰہی کے ترانے الاپا کرتے تھے تو پہاڑ وجد میں آجاتے تھے' پرندے ان کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے' یہ اللہ تعالیٰ کا ان پر ایک خاص احسان تھا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ رات کے وقت' جبکہ آپؐ ان کے مکان کے پاس سے گزر رہے تھے' لحنِ داؤدی کے ساتھ قرآن مجید پڑھتے سنا' آپ ﷺ کافی دیر تک کھڑے سنتے رہے' صبح ملاقات ہوئی تو فرمایا: ((يَا اَبَا مُوْسٰى لَقَدْ اُوْتِيْتَ مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِيْرِ آلِ دَاوٗدَ))(۱) ''اے ابوموسیٰ! اللہ نے تمہیں تو آلِ داؤد کے سازوں میں سے ایک ساز عطا کیا ہے!'' تو رسول اللہ ﷺ نے باقی انبیاء و رُسل کے فضائل کو اُجاگر فرمایا ہے۔

الھُدٰی ـــــ ہدایتِ آسمانی کی تکمیلی صورت

میں نبوت و رسالت کے فرق کی طرف اشارہ کر چکا ہوں کہ نبوت ایک ذاتی حیثیت ہے اور رسالت ایک منصب ہے۔ یہ منصبِ رسالت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی میں اپنے عروج کو پہنچا۔ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ﴾ ''وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو'' ﴿بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ﴾ ''ہدایتِ کاملہ اور دینِ حق کے ساتھ''۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو دو چیزیں دے کر بھیجا گیا ہے۔ ایک ''الھُدٰی'' اور ایک ''دین الحق''۔ ''الھُدٰی'' کے بارے میں تقریباً اجماع ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے۔ انسانی فکر اور انسانی سوچ کے لیے ابدالآباد تک کامل راہنمائی کے لیے یہ قرآن دیا گیا ہے۔ قرآن مجید اپنے لیے لفظ ہدایت گویا اسمِ عَلَم کے طور پر استعمال کرتا

(۱) صحیح البخاری' کتاب فضائل القرآن' باب حسن الصوت بالقراءۃ للقرآن۔ وصحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب استحباب تحسین الصوت بالقرآن۔

ہے۔ یہ ھُدًی لِّلنّاس ہے' ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ہے۔ یہاں دونوں جگہ لفظ ھُدًی بطور اسم آیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں یہی لفظ فعل کی صورت میں آیا ہے: ﴿اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ﴾ (آیت ۹)۔ آیت زیر مطالعہ میں لفظ ''الھُدٰی'' آیا ہے' یعنی کامل و مکمل ہدایت۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ نوعِ انسانی کے قافلے نے ارتقاء کا سفر طے کیا ہے اور تقریباً ۷۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۶۰۰ بعد مسیح تک انسانی سوچ اپنی پختگی کو پہنچ گئی۔ اس دوران انسان بحیثیت انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا سوچ چکا۔ اس میں فلاسفۂ یونان بھی آ گئے اور فلاسفۂ ہند بھی۔ گوتم بدھ اور مہابیر بھی آ گئے اور کنفیوشس بھی آ گیا۔ غرض جتنے حکماء و فلاسفہ' اہلِ منطق اور دوسرے سوچنے والے لوگ تھے' اس تقریباً تیرہ سو سال کے عرصہ میں پیدا ہو گئے' اور اب نوعِ انسانی کو یہ ''الھُدٰی'' دے دی گئی۔ تورات ہدایت نامہ ضرور تھی' الھدیٰ نہیں تھی۔ اگر وہ الھدیٰ یعنی کامل و مکمل ابدی ہدایت ہوتی تو اس کو محفوظ کر لیا جاتا۔ مگر اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے نہیں لیا' وہ محفوظ نہیں رہی۔ حالانکہ کتاب بہرحال وہ بھی اللہ ہی کی تھی' اور اللہ اگر اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیتا تو کون اس میں تحریف کر سکتا تھا؟ لیکن نہیں' اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا' اس لیے کہ ابھی یہ ہدایت ارتقائی مراحل طے کر رہی تھی۔ سورۃ الحدید کی یہ آیت بڑی اہم ہے: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ.....﴾ (آیت ۲۵) ''ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان.....''

جب انسان اپنے ذہنی بلوغ کو پہنچ گیا تو کتابِ ہدایت کا آخری ایڈیشن ''الھدیٰ'' کی صورت میں اسے تھما دیا گیا۔ اگر اس کے بعد بھی انسان کو کوئی مزید ہدایت دی جانی ہوتی' اور اس میں کسی اضافے کا کسی پہلو سے کوئی امکان ہوتا تو ابھی ختمِ نبوت غیر منطقی بات ہو جاتی۔ یہ وہی انسان کے ذہنی بلوغ کا معاملہ ہے جسے علامہ اقبال نے ختمِ نبوت کے لیے بطورِ دلیل استعمال کیا ہے۔ انسانی ذہن کے ارتقاء اور عقلی بلوغ کا جو مرحلہ آ گیا تھا اس کا تقاضا تھا کہ انسان اب اس عہدِ طفولیت سے نکل چکا ہے جہاں قدم قدم پر اسے

کہا جائے کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ اس میں یہ استعداد پیدا ہو چکی تھی کہ اب اسے جامع اور کامل ہدایت دے دی جائے' ایک بنیادی ہدایت نامہ دے دیا جائے' اور اس کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھول دیا جائے کہ جیسے جیسے حالات بدلیں' اب اجتہاد کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ جدید دَور کا انسان اپنی نفسیاتی ساخت کے اعتبار سے بہت زیادہ احکام اور بہت زیادہ تفصیلی ہدایات کو پسند نہیں کرتا۔ جس طرح ایک بالغ نظر شخص اس کو پسند نہیں کرے گا' بلکہ اپنی توہین سمجھے گا کہ ایک ایک جزئی تفصیل اس کو بتائی جائے' اسی طرح نسلِ انسانی کے عقلی بلوغ کا یہ تقاضا تھا کہ ایک جامع ہدایت دینے کے بعد اب انسان کو ایک آزادی دی جائے۔ چنانچہ علامہ نے تو یہ بات بھی لکھی ہے کہ شخصی اطاعت اب ختم ہو چکی ہے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ نبی شخصاً مطاع ہوتا ہے' وہ اپنی ذات میں مطاع ہے' اس کی اطاعت لازم ہے۔ نوعِ انسانی اب عقلی بلوغ کی اس سطح پر پہنچ چکی تھی کہ شخصی اطاعت اس پر گراں گزرنے والی تھی۔ لہٰذا علامہ نے کہا ہے کہ ختمِ نبوت کے بعد اب کوئی شخص اپنی ذاتی حیثیت میں مطاع نہیں رہا۔ اب کتاب وسنت ہمارے پاس ایک علمی سرمایہ ہے۔ کوئی شخص معین اب یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرا کہنا مانو' میری اطاعت کرو۔ وہ سلسلہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم ہو گیا۔ نبوت بلاشبہ شخصی اطاعت کو لازم کرتی ہے۔ نبی کی ہر بات' اس کے چشم وابرو کی ہر حرکت حکم ہے۔ بلکہ نبی کا تو ہر عمل بھی' خواہ اس نے اس کا حکم نہ دیا ہو' واجب الاتباع ہے۔

''دِین الحَقّ'' کا مفہوم

محمد رسول اللہ ﷺ کو ''الھُدٰی'' کے ساتھ جو دوسری چیز دی گئی وہ ہے ''دِین الحق''! یہ دین حق دو الفاظ سے مل کر بنا ہے اور بظاہر مرکب اضافی ہے (حق کا دین)' لیکن عام طور پر اس کا ترجمہ ''سچا دین'' مرکبِ توصیفی کی شکل میں کیا جاتا ہے۔ عربی زبان میں مرکبِ توصیفی بشکلِ اضافت بھی آ جاتا ہے۔ مرکبِ اضافی کی صورت میں اس کے معنی ہوں گے ''حق کا دین''۔ حق کون ہے؟ از روئے قرآن ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ صرف ایک ہے۔ سورۃ الحج میں الفاظ آئے ہیں: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا

یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ ھُوَ الْبَاطِلُ﴾ (آیت ۶۲) ''یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور جس کو یہ پکارتے ہیں اس کے سوا وہی باطل ہے۔'' چنانچہ الحق صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ ''دین الحق'' مرکب اضافی بنائیے تو معنی ہوں گے ذاتِ حق کا دین یعنی اللہ کا دین' اور اگر اس کو مرکب توصیفی سمجھا جائے تو معنی ہوں گے ''سچا دین''۔

اب لفظ دین کی طرف آیئے۔ دَانَ یَدِیْنُ عربی زبان میں بدلے اور اطاعت کے لیے آتا ہے۔ اس کا بالکل بنیادی مفہوم بدلہ اور جزاء وسزا ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں' جو اساس القرآن اور اُمّ القرآن ہے' یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے: ﴿مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾۔ اس کا مطلب ہے ''بدلے کے دن کا مالک' جزاء وسزا کے دن کا مالک''۔ عربی زبان کی ایک کہاوت ہے: ''کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ'' یعنی ''جیسا کرو گے ویسا بھرو گے''۔ اور ایک بہت مشہور مصرع ہے: ''فَدِنَّاھُمْ کَمَا دَانُوْا'' کہ جیسے انہوں نے ہمارے ساتھ سلوک کیا ہم نے بھی اُن کے ساتھ ویسا ہی کیا!

بدلہ اور جزاء وسزا کے مفہوم سے اب یہ لفظ ذرا اور اوپر اٹھتا ہے۔ جزاء وسزا کے ساتھ لازم وملزوم ہے کوئی قانون' کوئی ضابطہ' جس کی پابندی کی جائے تو جزا ہے' خلاف ورزی کی جائے تو سزا ہے۔ لہٰذا لفظ ''دین'' قانون کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ مزید برآں ''دین'' اطاعت کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اور ان سب سے بڑھ کر ذہن میں رکھیے کہ قرآن مجید کی اصطلاح کے طور پر ''دین'' سے مراد ہے ایک پورا نظامِ زندگی' ایک منظم زندگی۔ اور منظم زندگی کے لیے لازم ہے کہ اس میں مطاع کا تعین کیا جائے۔ اب یہ بات پولیٹیکل سائنس کے طلبہ بڑی آسانی سے سمجھیں گے کہ کسی ملک کے سیاسی نظام میں سب سے پہلے جو مسئلہ طے ہو گا وہ یہ ہے کہ مقتدرِ اعلیٰ (sovereign) کون ہے؟ اقتدارِ اعلیٰ کس کا ہے؟ نظام جو بھی بنے گا اس میں سب سے پہلے یہ طے کرنا پڑے گا کہ اختیار کس کا ہے۔ ہر نظام کسی ایک اختیار کے گرد قائم ہوتا ہے۔ جس کی اطاعت کا وہ نظام ہو گا اس کا وہ دین قرار پائے گا۔ مثلاً قرآن مجید میں سورۂ یوسف میں ''دِینِ المَلِك'' کی ترکیب آئی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی

بنیامین کو اپنے پاس مصر میں روکنا چاہتے تھے' لیکن اُس وقت بادشاہی نظام کے تحت جو ملکی قانون رائج تھا اُس کی رو سے وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ تو تھے نہیں' البتہ وہ ایک بڑے عہدے پر فائز تھے' اور بادشاہ کا جو نظام مصر میں قائم تھا اس کے مطابق وہ اپنے بھائی کو روک نہیں سکتے تھے۔ الفاظ آئے ہیں:

﴿كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ۭ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ﴾ (آیت ۷۶)

''اس طرح تدبیر بتادی ہم نے یوسف کو۔ وہ ہرگز نہیں روک سکتا تھا اپنے بھائی کو اُس بادشاہ کے نظام میں.....''

اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے لیے وہ شکل پیدا کر دی جس سے وہ اپنے بھائی کو روک سکیں۔ چنانچہ جہاں بادشاہ مختارِ مطلق ہے' حاکمیت اس بادشاہ کی ہے' پورا نظام اس کے تحت ہے' وہ دین الملک ہے۔

اب غور کیجیے کہ ''دین اللہ'' کیا ہے؟ عجیب بات ہے کہ قرآن مجید میں ''دین الحق'' تین جگہ آیا ہے اور تین ہی جگہ ''دین اللہ'' آیا ہے۔ ایک تو سورۃ النصر میں: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝﴾ سورۃ النور میں آیا ہے کہ زانی اور زانیہ کو سزا دو' کوڑے لگاؤ اور دیکھو! اللہ کے اس قانون کے تحت حد جاری کرتے ہوئے اُن کے لیے کوئی رحم کا جذبہ تمہارے اندر پیدا نہ ہونے پائے۔ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ﴾ دین اللہ کے کیا معنی ہوئے؟ اللہ کا قانون' اللہ کی قائم کردہ اور متعین کردہ حد۔ تم اللہ سے بڑھ کر شفیق اور ودود نہیں ہو' تم اللہ سے بڑھ کر رحیم نہیں ہو۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس جرم کی یہ سزا مقرر کی ہے تو اس کے نفاذ کے وقت تمہارے دلوں میں کوئی رحم کا جذبہ پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ اور اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ بڑی وحشیانہ سزا ہے' تو گویا وہ یہ سمجھتا ہے کہ مَیں اللہ تبارک و تعالیٰ سے بڑھ کر خلق کے حق میں ودود بھی ہوں' رحیم بھی ہوں' شفیق بھی ہوں۔

سورۂ آل عمران میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا﴾ (آیت ۸۳) ''کیا یہ اللہ کے دین کے سوا

کوئی اور دین چاہتے ہیں' حالانکہ آسمان وزمین میں جو کچھ ہے وہ اُسی کی اطاعت کر رہا ہے؟'' چنانچہ دین اللہ اور دین الحق کو اچھی طرح ذہن میں متعین کر لیں کہ وہ نظامِ زندگی جو اطاعتِ خداوندی کے اصول پر قائم ہو۔ اس نظام میں مطاعِ مطلق انسان نہیں ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اس میں انسان' انسان کا حاکم نہیں ہے' نہ انسان خود اپنا حاکم ہے۔

ابھی تک انسان کی سوچ جتنی بلند گئی ہے اس کے پیشِ نظر آزادی کا تصور یہ ہے کہ کوئی انسان دوسرے انسان کا اور کوئی قوم دوسری قوم کی حاکم نہ ہو۔ لیکن اپنی حاکمیت کا تصور تو گویا انسانی سوچ کی معراج ہے۔ ہماری اجتماعی سوچ کا معیار یہی جمہوریت ہے۔ وہ تو گویا اس دور کی سب سے اعلیٰ قدر ہے جسے عوامی حاکمیت (popular sovereignty) کا نام دیا جاتا ہے۔ قرآن اس کی بھی نفی کرتا ہے۔ قرآن میں حاکمیت کا اصول دو ٹوک الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (یوسف:۶۷) بقول علامہ اقبال: ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی' باقی بتانِ آزری!

ایک قوم خود اپنے اوپر حکومت کی دعوے دار ہو تو یہ بھی اتنا ہی بڑا شرک ہے جتنا یہ کہ کوئی اور شخص کسی پر حاکمیت کا دعوے دار ہو کر آ جائے۔ ان میں نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ ''دین اللہ'' یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کی بنیاد پر پورا نظامِ زندگی قائم ہو جائے۔ اس کو قرآن اس طرح بھی تعبیر کرتا ہے: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال:۳۹) ''اور ان سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے''۔ یہ الفاظ قرآن حکیم میں دو جگہ آئے ہیں' سورۃ البقرۃ میں ''كُلُّهٗ'' کا لفظ نہیں ہے۔ ترتیبِ نزولی میں سورۃ البقرۃ کے فوراً بعد سورۃ الانفال آتی ہے' اگرچہ ترتیبِ مصحف میں خاصا فاصلہ ہے۔ ''دین کُل کا کُل اللہ کا ہو جائے'' کا مفہوم یہ ہے کہ نظامِ اطاعت میں حصے بخرے نہ رہیں کہ زندگی کا اتنا حصہ اللہ کی اطاعت میں' اتنا اپنی مرضی سے' اتنا زمانے کے چلن کے مطابق اور اتنا بازار

کے رواج کے مطابق بسر ہوگا۔ دین کے اس طرح حصے بخرے کر لینا بھی ایک نوع کا شرک ہے۔ قرآن کا مطالبہ ہے کہ پورے کا پورا دین اللہ کا ہونا چاہیے!

اس لفظ دین پر ایک اور اعتبار سے بھی غور کیجیے کہ پورے قرآن مجید میں اور پورے ذخیرۂ احادیث میں مذہب کا لفظ اس معنی میں نہیں آیا جس معنیٰ میں ہم بولتے ہیں۔ قرآن مجید میں لفظ مذہب سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ ہماری گفتگو میں عام طور پر پوچھا جاتا ہے: آپ کا مذہب کیا ہے؟ اور جواب میں ''اسلام'' کہہ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلام مذہب نہیں' دین ہے۔ بلکہ صحیح تر الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ اسلام صرف مذہب نہیں بلکہ ایک کامل دین ہے۔ مذہب ایک جزو ہے جو انسانی زندگی کے صرف ایک گوشے سے بحث کرتا ہے۔ اس میں کچھ اعتقادات (dogmas)' کچھ مراسم عبودیت (rituals) اور کچھ سماجی رسومات (social customs) ہیں۔ انتہائی سیکولر ذہن بھی مذہب کی نفی نہیں کرتا' لیکن سیکولرزم کی رو سے اجتماعی زندگی کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ مسلمان ہیں' ہندو ہیں' سکھ ہیں یا عیسائی ہیں' اپنے اپنے عقیدے رکھیے' ہر شخص اپنی اپنی پوجا پاٹ جس طور سے چاہے کرے' کچھ پرسنل لاء بھی اپنی حد تک کر لیجیے' لیکن قانون ملکی (Law of the Land) کا تعلق کسی مذہب سے نہیں ہوگا' نہ اسلام سے' نہ عیسائیت سے' نہ ہندومت سے' نہ بدھ مت سے' کسی سے نہیں۔ وہ تو خالص لوگوں کی آزادانہ مرضی پر عوامی حاکمیت کے تصور کی بنیاد پر طے ہوگا کہ قانون ملکی کیا ہے۔ چنانچہ سیکولرزم کے معنی مذہب کی نفی نہیں ہیں' وہ تو مذہب کا اثبات کرتا ہے' البتہ دین کی نفی کرتا ہے۔ اسی بنیاد پر ہندوستان یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ہمارے ہاں پوری مذہبی آزادی ہے۔ جبکہ اسلام مذہب نہیں ہے' اسلام دین ہے۔ اور دین کے بارے میں یہ بات جان لیجیے کہ جس طرح دو تلواریں ایک نیام میں نہیں سما سکتیں اسی طرح ایک ملک میں' ایک جگہ پر' ایک خطۂ ارضی پر دو نظام بیک وقت قائم نہیں ہو سکتے۔ البتہ مذہب دس بھی رہ سکتے ہیں۔ ہندوستان میں ہو سکتا ہے بیسیوں مذاہب ہوں' لیکن نظام ایک ہے اور وہ سیکولرزم ہے۔ تو جان لیجیے کہ اسلام دین ہے' محض مذہب نہیں ہے۔

آنحضور ﷺ کا فرضِ منصبی

یہ ساری وضاحت ذہن میں رکھتے ہوئے آیت کا اگلا ٹکڑا ملاحظہ کیجیے: ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ تاکہ اس کو غالب کر دے پورے کے پورے دین پر۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو جو دو چیزیں دے کر بھیجا گیا' ان میں سے پہلی چیز کا تقاضا ہے ابلاغ و تبلیغ' کہ قرآن پہنچا دیجیے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ﴾ (المائدۃ:٦٧) ''اے رسول! جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا اُسے پہنچا دیجیے۔ اگر پہنچانے میں کوئی کمی ہوگئی (بفرضِ محال) تو یہ فریضۂ رسالت میں کوتاہی شمار ہوگی!'' ''الہدیٰ'' کا ابلاغ و تبلیغ آپ کے فریضۂ رسالت کا تقاضا تھا' خواہ لوگوں کو پسند ہو یا ناپسند۔ مشرکین کا کہنا تھا کہ یہ قرآن بہت سخت (rigid) ہے' اس میں آپ ذرا لچک پیدا کیجیے۔ سورۂ یونس (آیت ۱۵) میں ان کے الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ﴾ ''(اے محمد ﷺ!) کوئی اور قرآن اس کے سوا لے آیئے یا اس کو بدل دیجیے''۔ آخر کچھ لے دے کر بات بنے گی۔ آپ چاہیں کہ کُل کی کُل بات منوالیں' یہ نہیں ہوسکتا۔ ہم مصالحت کے خواہش مند ہیں' لڑائی نہیں چاہتے۔ لیکن اس میں کچھ ترمیم کیجیے' اس کو بدل دیجیے یا کوئی اور قرآن لے آیئے۔ جواب دلوایا گیا: ﴿قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۗيِٕ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾ ''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے میرے لیے یہ قطعاً ممکن نہیں ہے کہ میں اپنی مرضی سے اس میں کوئی تغیر و تبدّل کر دوں' میں تو خود پابند ہوں اُس کا جو مجھ پر وحی کیا جا رہا ہے''۔ تو الہدیٰ کے سلسلے میں مکّی سورتوں میں یہ مضمون بار بار آیا ہے کہ قرآن کو پہنچایئے' اِس کی تبلیغ کیجیے' اِس کی اشاعت کیجیے' اس کی تذکیر کیجیے' اس سے تبشیر کیجیے' اس سے انذار کیجیے۔ نبی اکرم ﷺ الہدیٰ دے کر بھیجے گئے تاکہ اس کو پہنچا دیں جیسا کہ اس کو پہنچانے کا حق ہے اور دینِ حق دے کر بھیجے گئے' تاکہ اس کو غالب کریں پورے کے پورے دین پر۔ یہ نظام قائم ہونے کے لیے آیا ہے اور یہ نظام حجت اُسی وقت ہوگا

جب اس کو قائم کر کے دکھا دیا جائے گا۔

نوعِ انسانی نے عقلی بلوغ کے ساتھ ساتھ اجتماعی شعور کا سفر بھی طے کیا ہے۔ قبائلی زندگی کے بعد شہری ریاستیں اور پھر بڑی عظیم سلطنتیں اور مملکتیں وجود میں آئیں۔ اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ایسے وقت میں ہوئی جب اُس دور کا آغاز ہو رہا تھا کہ انسانی زندگی پر اجتماعیت کی گرفت ہمہ گیر ہو جانے والی تھی۔ آج اجتماعیت کی ہمہ گیر گرفت کا اندازہ اس سادہ سی مثال سے کیجیے کہ آپ کا ایک خاص نقطۂ نظر ہے' اللہ تعالیٰ نے آپ کو توفیق دی ہے کہ آپ مسلمان جینا اور مرنا چاہتے ہیں' آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اپنی اولاد کو بھی اسی نقطۂ نظر پر پروان چڑھائیں' لیکن کیا کریں' بے بس ہیں! ایک پورا تعلیمی نظام ہے' جس کے تحت تعلیمی نصاب متعین ہوتا ہے۔ بڑے بڑے ایکسپرٹ بیٹھے ہوئے ہیں جو تعلیمی پالیسیاں مرتب کرتے ہیں' نصاب کے بارے میں بہت اعلیٰ سطح پر فیصلے ہوتے ہیں۔ آپ کیا کریں گے' آپ مجبور ہیں کہ اپنے بچے کو اس نظامِ تعلیم کے حوالے کر دیں۔ اس کے بعد آپ کی مرضی کو کوئی دخل نہیں' آپ کی پسند ناپسند کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ آپ دیکھتے رہیے اور آپ کی نگاہوں کے سامنے آپ کے بچے کے اندر الحاد اور مادہ پرستی سرایت کرتی رہے گی۔ بقول اقبال:۔

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ؟

آپ کے لیے سوائے ایک گھٹن کے' سوائے بے چینی کے' سوائے ایک کوفت کے کوئی چارہ نہیں' آپ کے پاس کوئی اختیار نہیں۔ صرف ایک راستہ ہے اُس شخص کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ توفیق دے دے اور وہ اپنی منزل متعین کر لے کہ دنیا سرے سے مقصود نہیں۔ لیکن یہ انتہائی فیصلہ کرنے کی ہر ایک شخص میں ہمت نہیں ہے' یہ تو ہزار میں سے ایک کرے گا بلکہ لاکھ میں سے ایک کرے گا۔ وہ آخری فیصلہ یہ ہے کہ اس نظامِ تعلیم سے بالکل کٹ جائیں۔

یہی وہ بات تھی جس پر انگریز کی آمد کے بعد ہمارے ہاں اختلاف ہوا ہے۔ ایک

رائے یہ تھی کہ انگریزی پڑھو ورنہ دنیا میں پیچھے رہ جاؤ گے۔ وہ رائے بھی خلوص پر مبنی تھی۔ دوسری رائے تھی کہ زمانے سے کٹ جائیں تو کوئی پرواہ نہیں' دقیانوسی قرار پا جائیں تو کوئی پرواہ نہیں' زمانے کا ساتھ نہ دے سکیں تو کوئی پرواہ نہیں' لیکن اس جدید نظامِ تعلیم کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے۔ اب دونوں نظامہائے تعلیم کی اپنی خوبیاں اور merits بھی ہیں اور دونوں کی کمزوریاں بھی ہیں' لیکن پوری قوم کا دھارا اُدھر نکل گیا جدھر روٹی کا ٹکڑا لٹکا ہوا تھا۔ ذہنوں پر یہی سوچ مسلط ہوگئی کہ لڑکا میٹرک پاس کرلے گا تو کلرک ہو جائے گا' بی اے' ایم اے کرلے گا تو اور اچھی ملازمت مل جائے گی۔ وکیل بن جائے گا یا ڈاکٹری کرلے گا تو اُس کا دنیوی مستقبل روشن ہو جائے گا — اور اگر دینی تعلیم حاصل کرے گا تو کیا کرے گا؟ مسجد کی امامت! اور مسجد کی امامت اب تو کچھ بہتر پیشہ بن گیا ہے' اب تو ائمہ کے بھی گریڈ معین ہیں اور باقاعدہ شرائط ملازمت طے ہوتی ہیں۔ ایک دَور وہ تھا جب کہ مسجد کے امام کی گزراوقات محلے کی روٹیوں پر ہوتی تھی۔

اجتماعی نظام کی اپنی پیچیدگیاں اور اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ انفرادی زندگی کی اتنی پیچیدگیاں نہیں ہیں جتنی اس نظامِ اجتماعی کی ہیں۔ فرد کو ذرا سی اہمیت دیجیے تو اجتماعیت متاثر ہوتی ہے۔ اجتماعی مصلحتوں کا زیادہ لحاظ کیجیے تو انفرادی آزادی اور حریت پامال ہوتی ہے۔ سرمائے کی تھوڑی سی ہمت افزائی کیجیے تو مزدور ظلم کی چکی میں پسنے لگتا ہے اور مزدور کی تھوڑی سی پشت پناہی کیجیے تو سرمایہ بدک جاتا ہے' وہ آگے نہیں بڑھتا' سرمایہ کاری نہیں رہتی۔ اسی طرح کا معاملہ مرد و زن کے حقوق و فرائض کا ہے۔ تو نقطۂ عدل کہاں ہے؟ مرد کو قوامیت بھی دی جائے اور عورت کو حیثیت بھی ملے' یہ توازن صرف اللہ کے دیے ہوئے دین میں مکمل طور پر ممکن ہے' اور کہیں نہیں۔ ذاتی ملکیت بھی ہو لیکن اونچ نیچ اتنی نہ پیدا ہو سکے جتنی کسی سرمایہ دارانہ نظام میں ہوتی ہے' یہ اعتدال سوائے دینِ حق کے اور کہیں نہیں مل سکتا۔ آزادی بھی ہو' حریت بھی ہو' تنقید کی آزادی بھی ہو' کہ ایک درویش کھڑا ہو کر عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کہے کہ: ''لَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ!'' ایک بڑھیا کھڑی ہو جائے اور چیلنج کر دے کہ یہ آپ نے کیا آرڈیننس نافذ کر دیا ہے ہمارے مہر کے

بارے میں؟ جس کی کوئی حد اللہ نے مقرر کی نہ اس کے رسولؐ نے' اے عمرؓ! تم کون ہوتے ہو اس پر حدود قائم کرنے والے؟ اور عمرؓ یہ کہے کہ آج ایک بڑھیا نے عمرؓ کو دین سکھایا ہے۔ آزادی کا یہ عالم ہو! ساتھ ہی وہ مساوات بھی ہو کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیت المقدس کا سفر کر رہے ہوں اور غلام کے ساتھ اونٹ پر سوار ہونے کی باری مقرر کر رکھی ہو۔ اور یہ سفر بھی سرکاری تھا' کیونکہ آپ بیت المقدس کا چارج لینے جا رہے تھے' کوئی ذاتی سفر نہیں تھا۔ اس سفر میں کوئی طائفہ' کوئی مصاحبین' کوئی خدم وحشم نہیں تھے' بس ایک اونٹ اور ایک غلام آپ کے ہمراہ تھا۔ ایک منزل خلیفۂ وقت سوار ہوتا اور غلام نکیل پکڑ کر آگے آگے چلتا۔ اگلی منزل اس شان سے طے ہوتی کہ غلام اونٹ پر سوار ہوتا اور خلیفۂ وقت نکیل تھام کر آگے آگے چلتا۔ مساوات کا یہ نقشہ چشم عالم دوبارہ نہیں دیکھ سکی۔ یہاں تو یہ صورت حال ہے کہ مساوات لائیے تو آزادی ختم۔ یہ دین حق ہی ہے جو ان تمام پہلوؤں کے مابین ایک توازن پیدا کرتا ہے۔

ذرا سوچئے تو! اگر کوئی شخص صرف نظری طور پر کہے کہ ایسا ممکن ہے کہ مرد قوام بھی ہو اور عورت پھر بھی جوتی کی نوک نہ بنے' اس کے حقوق ہوں' اُس کا مرتبہ اور حیثیت ہو' اس کو پوری ایک شخصیت دی جائے' عوام کو آزادی بھی حاصل ہو اور مساوات بھی ہو' ان دونوں چیزوں کو بیک وقت جمع کیا جائے' تو آپ فوراً کہیں گے کہ یہ محض ایک خیالی جنت (Utopia) کا نقشہ ہے' یہ ہونے والی بات نہیں۔ جب تک اس نظام کو قائم کر کے اس کو چلا کر نہ دکھا دیا جائے کوئی نظری طور پر اس کا یقین نہیں کرے گا۔ چنانچہ یہ فرضِ منصبی ہے محمد رسول اللہ ﷺ کا "لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" کے بارے میں۔ آپ ﷺ کو کتاب دی گئی تو اس کا تقاضا تو پورا ہو گیا کہ تبلیغ کا حق ادا کر دیا۔ اس کے ساتھ جو دین حق دیا گیا' آپؐ کا فرضِ منصبی اس کو نافذ کرنا' غالب کرنا' قائم کرنا' چلا کر دکھانا تھا۔ نوعِ انسانی پر حجت اسی صورت میں قائم ہو سکتی تھی۔ وہ جو بنیادی مقصد تھا بعثتِ انبیاء کا اس کو ذہن میں رکھئے۔ اس دَور کے اعتبار سے کہ جس میں محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہو رہی تھی اتمامِ حجت صرف اس طریقے پر ہو سکتا تھا کہ صرف انفرادی ہدایات نہ ہوں' صرف اخلاقی

تعلیمات نہ ہوں' صرف نظری طور پر کوئی چیز پیش نہ کر دی جائے۔ ایک مکمل نظامِ زندگی دیا جائے اور اسے عملاً قائم کر کے دکھا دیا جائے' تب حجت قائم ہوگی نوعِ انسانی پر۔ یہ اتمامِ حجت محمد رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت ہے۔

محض وعظ و نصیحت میں اور اس بات میں کہ آپ کسی غلط نظام کو بیخ و بُن سے اکھیڑ کر صحیح نظام کو قائم کر رہے ہیں بڑا فرق ہے ع :''زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است!'' آپ وعظ کہیے' نصیحت کیجیے۔ کہیں ایسا بھی ہوگا کہ آپ کا استہزاء اور مذاق اڑایا جائے' کہیں گلے میں ہار بھی ڈالے جائیں گے' آؤ بھگت بھی ہوگی' دعوتیں بھی ہوں گی' لوگ قدموں میں آنکھیں بچھائیں گے۔ لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ لوگو! سیدھے ہو جاؤ' ظلم کو ختم کرو' عدل قائم کرو' سب اللہ کے بندے بن جاؤ' کوئی کسی کا آقا نہیں۔ ع :''تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے!'' کوئی اونچ نیچ نہیں۔ كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا' سب اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جاؤ! تو لوگوں کی پیشانیاں شکن آلود ہو جائیں گی۔ نظام بدلنے کا یہ داعیہ جہاں بھی آئے گا کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں ہوگا۔ اس نظام سے جن کے مفادات وابستہ ہیں اور نظام کی تبدیلی سے ان مفادات پر زد پڑتی ہے وہ کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ اسی لیے ان دو مقامات پر یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝﴾ اس دین کو قائم کرنا' غالب کرنا' نافذ کرنا آپ ﷺ کا فرضِ منصبی ہے خواہ مشرکوں کو کتنا ہی ناپسندیدہ ہو۔ دینِ حق کو ناپسند کرنا ایک مشرک کے شرک کا لازمی تقاضا ہے۔ چنانچہ مشرکین تو مخالفت کریں گے' قدم قدم پر روڑے اٹکائیں گے' راستے میں کانٹے بچھائیں گے' سر پر راکھ ڈالیں گے' پتھروں کی بارش ہوگی' شِعبِ بنی ہاشم راستے میں آئے گی' یومِ بدر' یومِ اُحد' یومِ احزاب اور یومِ حنین آئیں گے۔ لیکن آپ ﷺ کا کام اس دین کو غالب کرنا' نافذ کرنا' قائم کرنا ہے۔

سورۃ الشوریٰ (آیت ۱۳) میں پہلے اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ﴾ یعنی ''اے مسلمانو! جو دینِ حق تمہیں دیا گیا ہے وہ اس لیے دیا گیا ہے کہ اسے قائم کرو اور اس کے بارے میں متفرق نہ ہو جاؤ!'' اور اس

کے بعد رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا: ﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ ۚ﴾ (آیت ۱۵) ''(اے نبی ﷺ!) پس آپ اسی (دین) کی دعوت دیتے رہیے اور اسی پر مضبوطی سے ڈٹے رہیے جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے اور آپ ان کی خواہشات کی پیروی مت کیجیے!'' سورۃ الشوریٰ کی یہ آیات اُس دَور میں نازل ہوئی ہیں جب اہلِ مکہ ایذا رسانی (persecution) کے تمام حربے آزمانے کے بعد مایوس ہوکر اب مصالحانہ پیشکشیں کر رہے تھے۔ چنانچہ بادشاہت بھی پیش کی گئی' دولت بھی پیش کی گئی' یہ بھی کہا گیا کہ آپ جہاں شادی کرنا چاہیں' اشارہ کر دیجیے۔ یہ پیشکشیں اسی وقت ہوئی ہیں جب انہوں نے دیکھ لیا کہ تشدد ناکام ہو چکا ہے۔ اُس وقت انہیں جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ جواب دلوایا گیا۔ یعنی میں محض واعظ بن کر نہیں آیا ہوں' میں تو اس نظامِ عدل کو قائم کرنے آیا ہوں۔ صرف نصیحت کر دینا اور وعظ کہہ دینا میرا مشن نہیں ہے' اس نظام کو بالفعل قائم کر دینا میرا فرضِ منصبی ہے۔

یہ ہے ختمِ نبوت اور اتمامِ رسالت کا وہ مقام جس کو نہ اپنے سمجھے نہ غیر سمجھے۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تیئیس سالہ پوری جدوجہد اسی مقصد کے لیے نظر آتی ہے۔ دورِ جدید کی اصطلاح کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تیئیس سالہ جدوجہد ایک عظیم انقلابی جدوجہد تھی۔ آپؐ کے پیشِ نظر ایک نظام کو جڑ سے اکھیڑ کر دوسرا نظام برپا کرنا تھا۔ اور انقلاب صرف وعظ سے نہیں آیا کرتا' انقلاب کے اپنے تقاضے ہیں۔ اس میں تصادم ہوتا ہے' اس میں کشمکش ہوتی ہے' اس میں قدم قدم آگے بڑھایا جاتا ہے' ایک قوت قدم بہ قدم آگے بڑھتی ہے اور دوسری قوت قدم بہ قدم پسپائی اختیار کرتی ہے۔ یہی انقلابی جدوجہد ہے جو نہ مستشرقین کی سمجھ میں آئی نہ مغربی مصنفین کی سمجھ میں آئی۔ اور ہم نے بھی سیرتِ مطہرہ کو اس کے حوالے سے بالکل نہیں سمجھا۔

نبی اکرم ﷺ کی جدوجہد کا نقطۂ آغاز دعوت الی اللہ تھا۔ اور آپؐ کی پوری جدوجہد سے انقلاب کا یہ طریق کار اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دعوت کے نتیجے میں جو لوگ قریب آئیں' اس دعوت پر لبیک کہیں' ان کی ایک منظم جماعت بنا لو' ایک منظم قوت بنا

لو۔ اپنے پیش نظر انقلاب کی مناسبت سے ان کی تربیت کرو اور پھر اسے معاشرے سے ٹکراؤ۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں اس قائم نظام کو اکھاڑ کر نظامِ عدل قائم کرو! اس کے کچھ تقاضے ہیں اور نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کو اس حوالے سے سمجھنا پڑے گا۔ ''لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ''، ختمِ نبوت، ختمِ رسالت، اتمامِ نبوت اور تکمیلِ رسالت کا تقاضا ہے اور حضور ﷺ کی بعثت کا یہ وہ خاص مقصد ہے جو کسی اور رسول کے لیے قرآن مجید میں نہیں آیا۔ یہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے آیا ہے اور آپؐ کی تیئیس (۲۳) سالہ جدوجہد کا حاصل ہے۔ ایک طرف ''الْهُدٰى'' پہنچا دی گئی، نظری طور پر بھی، عملی طور پر بھی، اور دوسری طرف وہ دینِ حق عملاً قائم کر دیا گیا۔ وہ کیسے قائم ہوا، اس کے خدوخال کیا ہیں، اس جدوجہد کے نمایاں مقامات و مراحل کیا ہیں؟ اس پر ان شاء اللہ العزیز آئندہ گفتگو ہوگی۔ نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جدوجہد کا ایک اجمالی خاکہ ان شاء اللہ العزیز اگلی نشست میں پیش کیا جائے گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

سلسلۂ خُطبات ③

حیاتِ طیّبہ کا مکی دَور

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ﴾ (التوبۃ:۳۳' الصف:۹) ..... ﷺ

سیرت وتاریخ کے موضوع پر سلسلۂ تقاریر کی یہ تیسری کڑی ہے۔ پچھلی دو نشستوں میں ہم نے دو موضوعات ''منصبِ رسالت اور اُس کا مقصد'' اور ''تکمیلِ رسالت اور اُس کے لوازم'' پر گفتگو کی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ نبوت ورسالت کا اصل مقصد خلقِ خدا کی ہدایت ورہنمائی کے ساتھ ساتھ محاسبۂ اُخروی کے ضمن میں اِتمامِ حجت ہے۔ چنانچہ عدالتِ اُخروی میں جب قوموں اور اُمتوں کا محاسبہ ہوگا تو اُن کی طرف جن رسولوں کو بھیجا گیا ہے' سب سے پہلے وہ گواہی دیں گے کہ اے اللہ! تیری ہدایت ورہنمائی اور تیرا پیغام جو ہم تک پہنچا تھا' ہم نے بلاکم وکاست قولاً بھی اور عملاً بھی اُن تک پہنچا دیا تھا۔ یہی وہ گواہی ہے جس کی وجہ سے قرآن مجید میں رسولوں کے لیے شاہد اور شہید کا لفظ کثرت سے استعمال ہوا ہے۔

نبی اکرم ﷺ پر نبوت ختم بھی ہوئی اور نبوت ورسالت اتمام اور تکمیل کو بھی پہنچی۔ اس اِتمامِ نبوت اور تکمیلِ رسالت کے دو مظہر بہت اہم ہیں۔ ایک یہ کہ نوعِ انسانی شعوری اور عقلی اعتبار سے عہدِ طفولیت سے نکل کر اپنے بلوغ کو پہنچ گئی اور گویا اس قابل ہوگئی کہ ابدی اور مکمل ہدایت نامہ اس کو دے دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ چونکہ اُس دَور کا آغاز ہو رہا تھا جس میں اصل اہمیت نظامِ اجتماعی کو حاصل ہو رہی تھی' لہٰذا ضرورت تھی کہ

ہدایتِ خداوندی اب صرف انفرادی اخلاق و کردار کے اعتبار سے نہیں بلکہ ایک مکمل اجتماعی نظامِ زندگی کی صورت میں سامنے آئے' جس میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں سے انصاف کیا گیا ہو اور کوئی قدر بھی اس میں پامال اور مجروح نہ ہو۔ مساوات' آزادی وحریت کی قیمت (cost) پر نہ ہو اور حریت و آزادی کا یہ نتیجہ نہ نکلے کہ نوعِ انسانی مراعات یافتہ (haves) اور مراعات سے محروم (have-nots) طبقات میں تقسیم ہو کر رہ جائے' کسی جگہ تو ارتکازِ دولت ہو جائے اور کوئی اپنی بنیادی ضروریات تک سے محروم ہو جائے۔ ایک متوازن نظامِ عدل وقسط اب نوعِ انسانی کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ کو یہی دو چیزیں دے کر بھیجا گیا: ایک الہدیٰ یعنی قرآن مجید' جو ابدی ہدایت نامہ قرار دیا گیا اور دوسرے دین حق یعنی عدل وقسط پر مبنی مکمل اجتماعی نظامِ زندگی۔ اور آپ ﷺ کا فرضِ منصبی یہ قرار پایا کہ ایک طرف تو قرآن کی تبلیغ کا حق ادا کر دیں اور دوسری طرف دین حق کو بالفعل قائم کر کے دکھا دیں' تاکہ نوعِ انسانی کے سامنے اس کا ایک نمونہ بھی آ جائے۔ یہ نظامِ عدل وقسط صرف نظری سطح پر پیش نہ کیا جائے' بلکہ اس کو قائم کر کے' چلا کر دکھا دیا جائے۔ یہ گویا اس دَور میں اصل اتمامِ حجت ہے جس کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا فرضِ منصبی یہ قرار پایا: ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾۔ اس کے بارے میں گزشتہ نشست کے آخر میں یہ بات عرض کی گئی تھی کہ اس پہلو سے نبی اکرم ﷺ کی تیئیس سالہ جدوجہد ایک مکمل انقلابی جدوجہد ہے۔ اگرچہ اس میں دعوت بھی ہے' تبلیغ بھی ہے' تربیت بھی ہے' تزکیہ بھی ہے' تعمیرِ اخلاق بھی ہے' تطہیرِ فکر بھی ہے' لیکن اس تیئیس سالہ جدوجہد میں ایک مکمل انقلابی جدوجہد کا نقشہ ملتا ہے۔

نسلِ انسانی کی عظیم ترین شخصیت

گزشتہ نشست میں مغربی مفکرین میں سے دو کا ذکر کیا گیا تھا۔ اپنے اس سلسلۂ تقاریر میں مجھے آگے چل کر اس موضوع پر بھی گفتگو کرنی ہے کہ الحمدللہ دورِ حاضر میں ایک احیائی عمل کا آغاز ہو چکا ہے' ایک بیداری ہے' عروج کی طرف ایک حرکت شروع ہو چکی

ہے۔ وہ جو مولانا حالی نے کہا تھا کہ ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے　　اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد　　دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

وہ بات اب نہیں ہے' دریا اب مد کی طرف آ رہا ہے۔ اس کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ اس دَور میں اب مسلمانوں کو اور اسلامی ثقافت کو سمجھنے کی واقعتاً سنجیدہ کوشش ہو رہی ہے۔ اب تک یورپ نے مسلمانوں کو یا اسلام کو سرے سے کوئی اہمیت دی ہی نہیں تھی' استہزاء ہوتا تھا' تمسخر ہوتا تھا' لیکن اب وہ بات نہیں ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں' لیکن اس کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ اب نبی اکرم ﷺ کی سیرت کو حالات اور حقائق کے قرینے (context) میں سمجھا جائے۔ چنانچہ حال ہی میں امریکہ میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے[1] جس کا نام ہے ''The Hundred'' اور اس کے مصنف ہیں ڈاکٹر مائیکل ہارٹ۔ اس کتاب پر Times اور Newsweek جیسے جرائد میں پورے پورے صفحے کے تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں معلوم انسانی تاریخ میں سے ایسے ایک سو انسانوں کا انتخاب کر کے ان کی درجہ بندی (gradation) کی گئی ہے جنہوں نے انسانی تمدن کے دھارے کے رُخ کو موڑنے میں مؤثر کردار ادا کیا۔ اور اس درجہ بندی میں اس مصنف نے سرفہرست رکھا ہے محمد رسول اللہ ﷺ کو۔ گویا تسلیم کر لیا گیا ہے کہ نسل انسانی کی عظیم ترین شخصیت ہیں محمد ﷺ۔ وہ شخص خود تو اپنی جگہ پر کوئی سند نہیں ہے' لیکن جو بات اس نے کہی ہے وہ اس کی ذہانت و فطانت کی غمازی کرتی ہے۔ ان لوگوں کے ہاں زندگی کے دو دائرے ہیں' مذہبی دائرہ اور سیکولر دائرہ۔ گویا سیاست و مملکت اور تہذیب و تمدن کا دائرہ اور ہے' جبکہ مذہب کا دائرہ اور ہے۔ اس نے تاریخ انسانی کی عظیم ترین شخصیتوں میں محمد عربی ﷺ کو سرفہرست رکھنے کی دلیل یہ دی ہے کہ آپ ﷺ نسل انسانی کی واحد شخصیت ہیں جو زندگی کے دونوں دائروں میں مساوی طور پر کامیاب ہیں۔ اس کے اپنے الفاظ ملاحظہ کیجیے:

---

(۱) واضح رہے کہ یہ خطاب ۱۹۷۸ء کا ہے۔ متذکرہ بالا کتاب اسی سال شائع ہوئی تھی۔

"My choice of Muhammad to lead the list of the world's most influential persons may surprise some readers and may be questioned by others, but he was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."

چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد کا ایک اجمالی نقشہ آپ حضرات کے سامنے رکھوں۔ لیکن اس سے قبل انقلاباتِ عالَم میں انقلابِ محمدیؐ کا جو مقام ہے اُس پر ایک نگاہ ڈال لیجیے۔

دنیا کا واحد جامع ترین انقلاب

آنحضور ﷺ کا برپا کیا ہوا انقلاب دو اعتبارات سے دنیا کے بڑے بڑے انقلابات سے انتہائی ممیز ہے۔ ایک تو جامعیت کے پہلو سے۔ اس لیے کہ دنیا میں جتنے بڑے بڑے انقلابات کا شہرہ ہے وہ سب کے سب جزوی انقلابات تھے۔ انقلابِ فرانس کے نتیجے میں صرف ہیئتِ حاکمہ یا طرزِ حکومت بدلا ہے' اخلاق نہیں بدلے' نظریات نہیں بدلے' کردار نہیں بدلا' تہذیب وتمدن اور معاشرت کا نقشہ نہیں بدلا' مذہب نہیں بدلا' عقائد نہیں بدلے' صرف ایک انتظامی ڈھانچہ بدلا ہے۔ ظاہر ہے طرزِ حکومت کی تبدیلی محض ایک جزوی انقلاب ہے۔ اسی طرح بالشویک ریوولیوشن اگرچہ اپنے اثرات کے اعتبار سے اور اپنی وسعت کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا انقلاب شمار ہوتا ہے' لیکن یہاں بھی تجزیہ کیجیے تو ثابت ہوگا کہ وہ بھی جزوی انقلاب ہے۔ نظریات میں بنیادی طور پر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پہلے سے موجود مادّہ پرستی (Materialism) نے ایک قدم آگے بڑھا کر جدلی مادیت (Dialectical Materialism) کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ گویا مادیت کا اگلا قدم ہے۔ انقلاب کہتے ہیں تبدیلی کو' لیکن یہاں تبدیلی کوئی نہیں آئی۔ مادیت کی جگہ روحانیت کا آغاز ہو تو وہ انقلاب ہوگا۔ مادیت ہی کے راستے پر آپ ایک قدم اور آگے بڑھ گئے تو اس میں انقلاب کا کوئی پہلو نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہاں کیا چیز بدلی؟ بس ایک کوشش کی گئی کہ کسی ملک کے وسائل

پیداوار اور ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت میں لا کر ایسا انتظام کیا جائے کہ وہاں کے رہنے والے سب کے سب اس سے متمتع ہوں۔ اس مقصد میں کتنی کامیابی ہوئی اور جو ہوئی وہ کس cost پر ہوئی' اس کو چھوڑیے۔ اِس وقت اس انقلاب کا حوالہ صرف اس اعتبار سے دیا گیا ہے کہ وہ بھی ایک جزوی انقلاب تھا۔

اس پس منظر میں اب نبی اکرم ﷺ کے انقلاب کو دیکھئے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہاں آپ کو خوردبین لگا کر ڈھونڈنا پڑے گا کہ کیا چیز نہیں بدلی! عقائد بدلے' اخلاق بدلے' انفرادی زندگی بدلی' ہیئتِ اجتماعیہ کا نقشہ بدلا۔ ایک قوم جس میں لکھے پڑھے لوگ گنتی کے تھے وہ قوم علوم وفنون کی موجد اور نوعِ انسانی کی معلم بن گئی۔ وہ قوم جس میں کوئی تنظیم نہ تھی' ایسی منظم ہوئی کہ نہ صرف میدانِ جنگ میں اُس کی تنظیم بے مثال قرار پائی' بلکہ وہ عبادت بھی کر رہی ہے تو ایک امام کے پیچھے صف بستہ ہو کر۔ گویا زمین بدل گئی' آسمان بدل گیا۔ کوئی چیز ایسی نہیں جسے آپ کہہ سکیں کہ وہی رہ گئی جو پہلے تھی۔ یہ ہے ہمہ گیر انقلاب کہ پوری انسانی تاریخ میں اس کا کوئی متوازی نہیں' اس کی کوئی نظیر نہیں۔

ایک دوسری خصوصیت کے اعتبار سے بھی اس انقلاب کی پوری انسانی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ دنیا میں جو انقلابات واقع ہوتے ہیں تو انقلاب کا فکر دینے والا کوئی اور ہوتا ہے اور اس انقلاب کو برپا کرنے والے کچھ اور لوگ ہوتے ہیں۔ انسانوں میں بالعموم جامعیت نہیں پائی جاتی۔ جس شخص کی فکر اور سوچ کی قوتیں زیادہ فعال (developed) ہوتی ہیں اس میں قوتِ عمل کم ہوتی ہے اور جس کے قوائے عملیہ زیادہ چاق وچوبند ہوتے ہیں عام طور پر اس کی سوچ کی قوتیں اتنی بیدار نہیں ہوتیں۔ لہٰذا انقلابات کا معاملہ ایسا ہی نظر آتا ہے کہ مفکر کوئی اور ہوتا ہے اور عملی راہنما کوئی اور بنتا ہے۔ چنانچہ انقلابِ فرانس کی پشت پر فکر تو والٹیئر' روسو اور دوسرے مفکرین کا تھا' لیکن انقلاب بالفعل کچھ اوباش لوگوں کے ہاتھوں آیا۔ ان مفکرین کا اس کی عملی رہنمائی میں ذرہ برابر بھی دخل نہیں۔ اسی طرح بالشویک انقلاب کا مفکر کارل مارکس (۱۸۱۸ء تا ۱۸۸۳ء) تھا' لیکن اس کی زندگی میں کسی ایک گاؤں میں بھی انقلاب کا سوال پیدا نہیں ہوا۔ یہ تو اس کی موت کے کئی سال

بعد ایک بالکل دوسرے ملک میں ایک فعال شخص لینن (۱۸۷۰ء تا ۱۹۲۴ء) کے ہاتھ میں وہ فلسفہ آیا اور اس نے اس کی بنیاد پر انقلاب برپا کر دیا۔

اس پس منظر اور اس context میں نبی اکرم ﷺ کی جدوجہد کا جائزہ لیجیے۔ فردِ واحد سے دعوت کا آغاز ہوا اور کل تیئیس برس میں انقلاب برپا ہو گیا۔ (واضح رہے کہ یہ تیئیس برس قمری حساب سے ہیں' جو شمسی حساب سے بائیس برس بنتے ہیں۔) ایک عرصۂ زندگی (life span) میں ایک انقلابی جدوجہد کا تمام مراحل سے گزر کر کامیابی سے ہمکنار ہو جانا' اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ کے دامن میں موجود نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی دُنیوی زندگی بڑی مختصر رہی ہے' محض اکسٹھ برس۔ ہم جو تریسٹھ برس کہتے ہیں وہ قمری اعتبار سے ہیں' جو دراصل اکسٹھ یا ساڑھے اکسٹھ برس بنتے ہیں۔ ان میں سے قبل بعثت کے چالیس سال نکال دیجیے تو کل ساڑھے اکیس' بائیس برس ہیں' جن میں ایک عظیم انقلاب تمام مراحل طے کر کے پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ پوری نسل انسانی کی تاریخ میں اس کے آس پاس تو کیا' اس کے عشرِ عشیر کی بھی مثال نہیں ملتی۔

اب آیئے اس بات کی طرف جو اس انقلابی جدوجہد کا اہم ترین پہلو ہے' اور جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں' کہ یہ پوری جدوجہد زمین پر ہوئی ہے' قدم بقدم چل کر ہوئی ہے' خالص انسانی سطح (human level) پر ہوئی ہے' اور دنیا میں اللہ تعالیٰ کے قواعد و ضوابط اور اسباب و علل کا جو سلسلہ چل رہا ہے' ان کے تحت ہوئی ہے۔ اور اس کو یوں سمجھئے کہ یہ بھی درحقیقت اتمامِ حجت کا ایک پہلو ہے۔ وہ نظام قائم کر کے دکھا دینا اتمامِ حجت ہے پوری نوعِ انسانی پر' اور اس کو ایک عام انسانی جدوجہد کی سطح پر' تمام موانع و مشکلات کے باوجود قائم کر کے دکھانا' ابتدائی دور میں ناکامیوں کا طرح طرح سے سامنا کر کے اور مصائب و مشکلات کو جھیل کر قائم کر کے دکھانا' یہ درحقیقت حجت ہے مجھ پر' آپ پر اور پوری اُمتِ محمد ﷺ پر۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ نبی اکرم ﷺ نے تو یہ کام کر دیا' اس لیے کہ آپؐ کو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خصوصیات حاصل تھیں کہ آپؐ کے تو پاؤں میں کانٹا بھی نہیں چبھا' آپؐ کی تو نکسیر تک نہیں پھوٹی'

آپؐ کے لیے تو کہیں کوئی دقت اور مشکل پیش آئی ہی نہیں' جبکہ ہمارا معاملہ اور ہے۔ ہم سے یہ مطالبہ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ ہم بھی اللہ کے دین کو قائم کریں جیسے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا۔ چنانچہ یہ اتمامِ حجت ہے اُمت محمد ﷺ پر۔

درشبستانِ حرا خلوت گزید

اب ذرا اس بائیس سالہ انقلابی جدّوجُہد کا طائرانہ نظر سے ایک جائزہ لیجیے۔ ہمارا معاملہ درحقیقت رسول اللہ ﷺ سے دُوری اور بُعد کا ہے۔ عشق کے تمام تر دعووں کے باوجود اگر آپ اپنے گریبان میں جھانکیں کہ ہمیں آنحضور ﷺ سے کتنا تعلق ہے تو اس کے لیے ایک بڑا آسان سا پیمانہ یہ ہے کہ ذرا سوچیے اس تیئیس سالہ یا بائیس سالہ جدوجہد کے بائیس واقعات بھی آپ کو معلوم ہیں؟ ذرا چشمِ تصور سے آغازِ کار کو ذہن میں لائیے۔ اللہ کا ایک بندہ جو اپنی ذاتی سیرت و کردار کے اعتبار سے انسانیت کی معراج پر فائز ہے' اُس نے اب تک جو زندگی بسر کی ہے وہ ایک بھرپور انسانی زندگی ہے' کہیں کسی خانقاہ میں زندگی بسر نہیں کی' کہیں کسی پہاڑ کی کھوہ میں نہیں رہے' چالیس برس بھرپور زندگی گزاری ہے' کاروبار کیا ہے تو اعلیٰ ترین سطح پر کیا ہے' امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار ہے' تجارتی قافلے شام جا رہے ہیں' وہاں سے آ رہے ہیں' اور اس میدان میں اپنی امانت و دیانت کا لوہا منوایا ہے۔ شادی کی ہے' بھرپور عائلی زندگی بسر کی ہے' صاحبِ اولاد ہیں۔ لیکن چالیس برس کی عمر کے آس پاس وقت آیا ہے تو طبیعت میں یک دم خلوت پسندی کا غلبہ ہو گیا ہے' خلوت گزینی محبوب ہو گئی ہے' غارِ حرا میں کئی کئی دن مراقبہ ہو رہا ہے۔ اس کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے:

ثُمَّ حُبِّبَ اِلَيْهِ الْخَلَاءُ فَكَانَ يَخْلُوْ بِغَارِ حِرَاءٍ يَتَحَنَّثُ فِيْهِ (۱)

''تحنث'' عبادت کو کہتے ہیں۔ یہ عبادت کیا تھی؟ شارحین کہتے ہیں: **كان عبادته التفكر والاعتبار** یعنی آپ ﷺ کی یہ عبادت غور و فکر اور سوچ بچار تھی۔ سورۃ الشوریٰ میں نقشہ

(۱) صحيح البخاري' كتاب بدء الوحي' باب بدء الوحي۔ وصحيح مسلم' كتاب الايمان' باب بدء الوحي الى رسول الله ﷺ۔

کھینچا گیا ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ﴾ (آیت ۵۲)

''اور (اے نبی ﷺ!) اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک روح آپ کی طرف وحی کی ہے۔ آپ کو کچھ پتا نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے' مگر اُس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔''

آپ ﷺ کو معلوم نہ تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں' آپ تو اُمی تھے' کسی سابقہ آسمانی کتاب سے آپ کا ربط و تعلق نہیں تھا' کسی آسمانی شریعت سے آپ واقف نہ تھے۔ ایمان اجمالاً تو نبی کو پیدائشی طور پر حاصل ہوتا ہے' لیکن تفصیلاً ایمان کیا ہے' یہ ابھی آپ کو معلوم نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سب پردے اٹھائے' از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَوَجَدَكَ ضَاۗلًّا فَهَدٰى ۝﴾ (الضُّحیٰ)

''اور (آپ کے ربّ نے) آپ کو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو آپ کو راہ دکھائی۔''

غارِ حرا میں حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور وحی کا آغاز ہوا:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝﴾ (العلق)

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ایک وقت گزرا ہے جس میں آنحضور ﷺ کی تعلیم ہوئی ہے' اگرچہ ہم کو اس کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ آپ کی تعلیم ہماری سطح کی تعلیم نہیں ہے۔ الف' با' تا والی تعلیم نہیں ہے' لیکن تعلیم ہوئی ضرور ہے۔ قرآن حکیم کے الفاظ ہیں: ﴿عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝﴾ (النجم) ''اُسے زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے۔''

''تکبیرِ ربّ'' کا حکم

پہلی وحی کے چند ماہ بعد دوسری وحی نازل ہوئی:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝﴾ (المدثر)

''اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ)! اٹھو اور خبردار کرو۔ اور اپنے ربّ کی بڑائی کا اعلان کرو!''

اب کمر بستہ ہو جاؤ' کھڑے ہو جاؤ' اپنی عملی جدوجہد کا آغاز کر دو۔ اور اس کے لیے آپؐ کو دو کام تفویض کر دیے گئے' ایک انذار اور دوسرا تکبیر ربّ۔ یعنی لوگوں کو غفلت کے نتائج سے آگاہ کیجیے۔ خدا سے دوری کا جو انجام ہونے والا ہے' اس سے خبردار کیجیے۔ آخرت کی منزل جو ہر شخص کے لیے آ کر رہنی ہے' اس سے متنبہ کیجیے۔ اور اپنے ربّ کی بڑائی بیان کیجیے' اپنے ربّ کی بڑائی کا اعلان کیجیے! ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾ کا لفظی ترجمہ ہو گا: ''اور اپنے ربّ کو بڑا کیجیے!'' تصغیر کے معنی ہیں کسی کو چھوٹا کر دینا اور تکبیر کے معنی ہیں کسی کو بڑا کر دینا۔ ربّ کو بڑا کرو! اس معنی میں کہ ربّ کی بڑائی مانی جائے! اپنی جگہ وہ بڑا ہے' لیکن یہاں نہ معلوم کون کون ہیں جو اُس کی بڑائی کو چیلنج کرتے ہیں کہ ہماری مرضی چلے گی' اُس کی نہیں! ہماری پسند سے معاملہ طے ہو گا' ہم نہیں جانتے کہ ربّ کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند ہے! حکومت ہماری ہے' ہم نہیں جانتے کہ ربّ کون ہے! جس طرح فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں طنزاً پوچھا تھا: وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ؟ یہ کون ہوتے ہیں ربّ العالمین؟ اس طرح بالفعل تو پوری دنیا ربّ العالمین کو بھولے ہوئے ہے یا اُس کا انکار کیے ہوئے ہے اور اپنی خدائی کی دعوے دار ہے۔ اس صورتِ حال کو بدل کر اپنے ربّ کو بڑا کیجیے' اُس کی بڑائی منوایئے! حضرت مسیح علیہ السلام کا قول ہے: ''اے اللہ! تیری مرضی جیسے آسمانوں پر پوری ہوتی ہے ویسے ہی زمین پر پوری ہو!'' —— یہ ہے تکبیرِ ربّ۔ بقول علامہ اقبال مرحوم: ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل ۔۔۔ یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست ۔۔۔ یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

تکبیر ربّ کا یہ حکم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو اپنی جدوجہد کے آغاز ہی میں دے دیا گیا۔ یہ ہے وہ چیز جس کا ایک بارِ گراں محسوس کیا محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے اور اس کا اظہار فرمایا: ((خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ)) ''مجھے اپنی جان کا خدشہ ہے!'' اہلیہ محترمہ حضرت خدیجہ

الکبریٰ رضی اللہ عنہا آپ کو تسلی دے رہی ہیں کہ اللہ آپ کو ضائع نہیں کرے گا' آپ یتیموں کی سرپرستی فرمانے والے' بیواؤں کی خبر گیری کرنے والے' بھوکوں کو کھانا کھلانے والے اور مسافروں کی خدمت کرنے والے ہیں۔

دعوت کے ابتدائی تین برس

ابتدائی تین برس تک دعوت و تبلیغ اس سطح پر ہوئی ہے کہ صرف اپنے قریب ترین لوگ ہی اس دعوت کے مخاطب رہے ہیں۔ لفظ ''خفیہ'' کا استعمال کرنا تو درست نہیں ہوگا' خفیہ بات وہاں کوئی نہیں تھی' البتہ ڈنکے کی چوٹ بھی نہ تھی' علی الاعلان نہیں تھی۔ ذاتی تعلقات کی بنیاد پر دعوت اندر ہی اندر پھیل رہی تھی۔ آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سب سے پہلے ایمان لانے والی تھیں۔ اسی طرح آپ ﷺ کے قریب ترین دوست' جگری دوست حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے ہی زیر تربیت اور زیر کفالت چچازاد بھائی حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اپنے غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ایمان لائے۔ یہ چار افراد سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ اِن چاروں میں اوّلیت کا تعین بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس میں بڑی عمدہ مطابقت پیدا کی گئی ہے کہ عورتوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ آزاد اور بالغ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ بچوں میں سب سے پہلے حضرت علیؓ اور غلاموں میں سب سے پہلے حضرت زید بن حارثہؓ ایمان لائے۔ یہ چار حضرات محمد رسول اللہ ﷺ کی اوّلین کمائی ہیں' اور ان میں سب سے قیمتی کمائی حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں۔ معاشرے میں ان کو بلند مقام حاصل تھا' ان کی سچائی' امانت و دیانت' نیکی و راست بازی' خلق خدا سے ہمدردی اور وسعتِ قلب سب مسلّم تھی۔ پھر یہ کہ وہ اپنے معاشرے کے متمول فرد تھے' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس وقت جو ایک قبیلے کی حکومت تھی' اس میں ایک انتہائی نازک ذمہ داری ان کے سپرد تھی' یعنی دیت (خون بہا) کی رقم کا تعین اور قتل کے مقدمات کا فیصلہ کرنا' یہ منصب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس تھا۔ جب وہ ایمان لائے تو وہ ایک فرد نہیں ایک اُمت تھے۔ جیسے قرآن مجید میں آتا ہے کہ: ﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً﴾ چنانچہ عشرۂ مبشرہ میں سے چھ

حضرات وہ ہیں جو حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی دعوت پر ایمان لائے۔ حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ؓ کو لاکر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کرنے والے حضرت ابوبکر صدیق ؓ ہی ہیں۔ عشرۂ مبشرہ میں سے یہ وہ چوٹی کے صحابہؓ ہیں جو آپؐ کی دعوت و تبلیغ سے ایمان لائے۔

رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوا: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿٢١٤﴾﴾ (الشعراء) ''اپنے قریبی رشتہ داروں کو خبردار کیجیے!'' چنانچہ آپ ﷺ نے انسانی سطح پر بالکل فطری طریقہ اختیار کرتے ہوئے حضرت علی ؓ کو حکم دیا کہ دعوتِ طعام کا اہتمام کرو اور بنی ہاشم کو بلاؤ۔ چنانچہ بنی ہاشم کو جمع کر کے کھانا کھلایا گیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر دعوت پیش کرنا چاہی تو اُودھم مچ گیا، کسی نے بات نہ سنی۔ آخر چرچا تو ہو چکا تھا، انہیں معلوم تو تھا کہ ہمیں کس لیے جمع کیا گیا ہے۔ لہٰذا شور مچا دیا گیا اور بات سنی ہی نہیں گئی۔ اس طرح اوّلین کوشش ناکام ہوگئی۔

یہ بات ذہن میں رکھیے کہ میری گفتگو میں ناکامی کا لفظ بار بار آئے گا، اس سے کوئی مغالطہ نہ ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی کی کوشش ناکام نہیں ہوتی۔ نبی کے نقشِ قدم پر چلنے والے کسی انسان کی کوشش بھی ناکام نہیں ہوتی، اس اعتبار سے کہ اس کا اجر خدا کے ہاں محفوظ ہے۔ لیکن ایک ہے دنیا میں اس کوشش کے نتائج نکلنا۔ کامیابی کا یہ جو تصور ہے اس کے اعتبار سے یہ لفظ استعمال کر رہا ہوں کہ ناکامی کا سامنا ہوا۔ چنانچہ دوبارہ کوشش کی گئی، پھر کھانا کھلایا گیا۔ اس بار ذرا سا موقع مل گیا، رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر دعوت پیش کی۔ لیکن پورا مجمع گم سم رہا، صرف حضرت علی ؓ کھڑے ہوئے جو پہلے سے ہی اپنے تھے۔ آپؓ نے کھڑے ہو کر کہا: اگرچہ میری ٹانگیں پتلی ہیں، اگرچہ مجھے آشوبِ چشم بھی ہے، لیکن میں آپؐ کا ساتھ دوں گا۔ اس پر پورا مجمع کھلکھلا کر ہنس پڑا کہ چلے ہیں عالمی انقلاب برپا کرنے اور یہ ہیں ان کے ساتھی! اس طرح دونوں دعوتوں کا نتیجہ صفر رہا۔

کوہِ صفا کی پکار

اس کے بعد قلبِ محمد ﷺ پر حکم نازل ہوتا ہے:﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ (الحجر: ٩٤) ''پس (اے نبی ﷺ! ایک قدم آگے بڑھائیے اور) جس بات کا آپؐ کو حکم ہوا ہے اس کو ڈنکے کی چوٹ کہیے''۔ اس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے کیا تدبیر اختیار فرمائی؟ جن ظروف واحوال میں آپؐ کام کر رہے تھے ان میں ابلاغ کا جو بھی ممکن طریقہ تھا اسے آپؐ نے اختیار فرمایا۔ اُس دَور میں رواج یہ تھا کہ اگر لوگوں کو جمع کر کے کوئی بات سنانی ہوتی' یا کوئی اہم خبر دینی ہوتی تو کوئی شخص کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر نعرہ لگاتا تھا: ''وَاصَباحا''۔ اُس زمانے میں خبر کیا ہوتی تھی کہ فلاں قبیلہ تم پر حملہ کرنے والا ہے' ہوشیار ہو جاؤ! اپنا بچاؤ کر لو! اور وہاں یہ رواج بھی تھا کہ وہ شخص بلند مقام پر کھڑے ہو کر چیختا تھا' اپنے کپڑے پھاڑ ڈالتا تھا اور مادر زاد برہنہ ہو جاتا تھا تاکہ جس تک آواز نہ پہنچی ہو وہ بھی دیکھے تو سمجھ جائے کہ کوئی بات ہے جو یہ شخص ننگا ہو کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اسے نذیرِ عریاں کہتے تھے۔ آپ ﷺ نے بھی طریقہ وہی اختیار کیا' لیکن اس میں جو چیز شرم وحیا کے منافی تھی اس کو نکال دیا۔ آپؐ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر نعرہ لگایا: وَاصَباحا! لوگ جمع ہوئے کہ نہ جانے کیا بات ہے۔ آپ ﷺ نے دعوت پیش کی تو مجمع میں سے آپؐ کا چچا ابولہب بول اٹھا: تَبًّا لَکَ اَلِھٰذَا جَمَعْتَنَا؟ ''تمہارے ہاتھ ٹوٹ جائیں' کیا تو نے ہمیں اس کام کے لیے جمع کیا تھا؟'' (نقلِ کفر' کفر نباشد) ہم بڑی مصروفیات اور مشاغل میں تھے' ہم سمجھے واقعتاً کوئی بڑی اہم بات ہے۔ اس پر سورۃ اللھب نازل ہوئی:﴿تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ ①﴾ ''ٹوٹ گئے ہاتھ ابولہب کے اور نامراد ہو گیا وہ''۔ یعنی اسلام کی دعوت واشاعت کا راستہ روکنے کے لیے اُس نے جتنا زور لگایا اُس میں وہ ناکام ونامراد ہوا۔ یہ بات مستقبل کی پیشین گوئی کے طور پر فرمائی گئی' لیکن فوری طور پر تو اس کے ہاتھ نہیں ٹوٹے تھے۔ اُس وقت تو صورت یہ تھی کہ اس دعوتِ عام کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ گویا ناکامیوں پر ناکامی! یہی وجہ ہے کہ مکی سورتوں میں آپ ﷺ کو بار بار صبر کی تلقین کی گئی ہے کہ اے نبی! صبر کیجیے' جھیلیے' ہمت جواب نہ

دے' مایوسی اور ناامیدی پاس نہ پھٹکنے پائے: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (الاحقاف:۳۵) ''پس آپ صبر کیجیے' جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے۔'' سورۃ المدثر کی ابتدائی سات آیات میں آخری بات صبر ہے: ﴿وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝۷﴾ ''اور اپنے ربّ کی خاطر صبر کیجیے!'' سورۃ النحل میں فرمایا: ﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ﴾ (آیت ۱۲۷) ''اور (اے نبی ﷺ!) صبر سے کام لیجیے' اور آپ کا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے''۔ سورۃ المزمل میں ارشاد ہوا: ﴿وَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ۝۱۰﴾ ''اور صبر کیجیے ان باتوں پر جو یہ بنا رہے ہیں اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ ہو جائیے!''

ایک بات ذہن میں رکھئے' کسی بھی انقلابی دعوت کے نتیجے میں معاشرے کا پہلا ردِّعمل استہزاء و تمسخر ہوتا ہے کہ اسے چٹکیوں میں اڑا دیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ پاگل ہو گئے ہیں' جنون کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے' ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہا۔ کبھی مخلصانہ' دردمندانہ اور خیر خواہانہ انداز میں کہا جاتا ہے: اچھے بھلے آدمی تھے' کیا ہو گیا بیٹھے بٹھائے! چنانچہ تسلی کے لیے آیاتِ الٰہیہ اُتر رہی ہیں:

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۝۱ مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ ۝۲ وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ ۝۳ وَإِنَّكَ لَعَلَى خُلُقٍ عَظِيمٍ ۝۴ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُونَ ۝۵ بِأَيِّكُمُ الْمَفْتُونُ ۝۶﴾ (القلم)

''ن۔ قسم ہے قلم کی اور اُس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔ (اے نبی ﷺ! آپ ملول نہ ہوں) آپ اپنے ربّ کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔ اور یقیناً آپ کے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ ختم ہونے والا نہیں۔ اور بے شک آپ اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہیں۔ عنقریب آپ بھ دیکھ لیں گے اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون جنون میں مبتلا ہے۔''

یہ ہے وہ ابتدائی دَور جس میں دعوت کا سلسلہ جاری ہے۔

انقلابِ نبویؐ کے چند امتیازات

اس دَور کے متعلق دو باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ دعوت کا

ذریعہ تمام تر قرآن مجید ہے۔ زیرِ دعوت افراد کو آیاتِ قرآنی پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں۔ اگر معلوم ہوتا کہ فلاں جگہ کوئی قافلہ ٹھہرا ہوا ہے تو آپؐ وہاں پہنچتے اور ان سے کہتے کہ میرے پاس ایک کلام ہے جو میں پیش کرتا ہوں' انہیں آپؐ کلامِ الٰہی سناتے۔ تذکیر ہے تو قرآن کے ذریعے سے: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ﴾ (قٓ) ''بس آپ اس قرآن کے ذریعے سے ہر اُس شخص کو نصیحت کیجیے جو میری تنبیہ سے ڈرے''۔ انذار ہو رہا ہے تو قرآن کے ذریعے سے: ﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ﴾ (الانعام:۱۹) ''اور یہ قرآن مجھ پر وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ سے تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے' سب کو خبردار کر دوں''۔ تبشیر ہو رہی ہے تو بھی اسی قرآن کے ذریعے سے: ﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا﴾ (مریم) ''پس (اے نبیؐ!) اس کلام کو ہم نے آپ کی زبان میں آسان کر کے اسی لیے نازل کیا ہے تاکہ آپ اس کے ذریعے پرہیزگاروں کو خوشخبری دے دیں اور ہٹ دھرم لوگوں کو متنبہ کر دیں''۔ گویا آپؐ کی دعوت کا مرکز و محور قرآن مجید ہی تھا:۔

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا!

دوسری بات یہ ذہن میں رکھیے کہ انقلابی جدوجہد کے بعض مراحل وہ ہیں جو تمام انقلابات میں مشترک ہوتے ہیں۔ دعوت' تنظیم' تربیت اور تصادم ہر انقلاب کے لازمی مراحل ہیں' لیکن انقلاب کو انقلاب سے ممیز کرنے والی چیز یہ ہے کہ دعوت کی بنیاد کیا ہے' اور جو جماعت اس دعوت کو قبول کر رہی ہے' اس کی تربیت کا اصول کیا ہے۔ یہاں سے دونوں طرح کے انقلاب کے راستے جدا ہو جائیں گے۔ ایک صالح انقلاب ہوگا اور ایک فاسد انقلاب ہوگا۔ ایک انقلاب وہ ہے جس کی بنیاد خدائے واحد کی پرستش اور آخرت کے یقین پر ہے' اعمالِ صالحہ' انسانی ہمدردی اور سچائی' اس کے ابتدائی لوازم (pre-requisites) ہیں۔ جبکہ ایک دعوت وہ ہے جس میں کسی قوم کی قومی عصبیت کو ابھارا گیا ہو' جس میں کسی نسل کی نسلی عصبیت کو اپیل کیا گیا ہو' جس میں طبقاتی شعور اُجاگر

کیا گیا ہو۔ زمین و آسمان کا فرق یہاں سے پڑے گا' ورنہ ''دعوت'' کا لفظ مشترک ہے۔ انہیں بھی دعوت پیش کرنی ہوگی' ہمیں بھی اپنی دعوت پیش کرنی ہوگی۔ کوئی سیاسی ہنگامہ' کوئی قومی نعرہ' کوئی طبقاتی کشمکش' یہ راستہ اور ہے' جبکہ ''قُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا'' کا راستہ اور ہے۔ چنانچہ اسلامی انقلاب کی دعوت یہ ہوگی کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ' آخرت کی تیاری کرو' اس کی جواب دہی کی تیاری کرو' اپنے آپ کو رذائل اور ذمائم اخلاق سے پاک کرو اور اپنی زندگیوں کو محاسن و مکارمِ اخلاق سے مزیّن کرو۔ تو اس فرق کو ذہن میں رکھئے۔ کہیں بار بار لفظ انقلاب کی تکرار سے آپ اس فرق کو نظر انداز نہ کر دیں۔ ع چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک!

ایک بات اور ذہن میں رکھئے کہ دنیا میں مذہبی تبلیغ عام طور پر سوسائٹی کے پست طبقات میں ہوتی ہے۔ لوگ اُن کی مظلومیت سے ذرا سا ہمدردی کا لبادہ اوڑھ کر اُن کے سامنے آتے ہیں اور ان کے نام بدلوا لیتے ہیں۔ کوئی سابقہ یا لاحقہ نام میں لگا اور انہوں نے رجسٹر میں درج کر لیا کہ ہم نے اتنے عیسائی بنائے ہیں۔ جو صادق علی تھا وہ صادق مسیح بن گیا۔ لیکن انقلابی دعوت ہمیشہ معاشرے کے اونچے طبقے اور ذہین ترین عنصر سے خطاب کرتی ہے۔ یہ دعوت عقلی بنیاد پر پیش کی جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایک نظریہ اور ایک فلسفہ کو قبول کرنے والے معاشرے کے اونچے طبقے کے لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ دیکھئے جن لوگوں کے نام ابھی گنوائے گئے ہیں' یہ اس سوسائٹی کا مکھن تھے۔ ابوبکر صدیق' عثمان غنی' عبدالرحمٰن بن عوف' طلحہ' زبیر اور سعید بن زید رضی اللہ عنہم —— یہ ہیں محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والے۔ اگرچہ یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ انقلابی دعوت کو قبول کرنے میں کچھ اور طبقات کے لوگ بھی پیش قدمی کرتے ہیں۔ اعلیٰ ترین طبقات میں سے تو جو بالکل صالح طبیعت کے لوگ ہوتے ہیں وہی آئیں گے۔ اس لیے کہ اُن کے پاؤں میں مفادات کی بیڑیاں پڑی ہوتی ہیں۔ وہ قائل تو ہو جاتے ہیں کہ بات درست ہے' لیکن اپنی چودھراہٹ' اپنے مقام و مرتبہ' اپنی وجاہت اور اپنے مفادات (vested interests) کو چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ یہ تو بہت ہی صالح مزاج اور سلیم

الفطرت لوگ ہوتے ہیں جو چھٹ کر آ جاتے ہیں۔

اس کے بعد دو طبقات اور ہیں۔ ایک نوجوانوں کا طبقہ' جس میں ابھی وہ مصلحت کوشی اور مصلحت بینی نہیں ہوتی جو پہلے طبقے کے لوگوں پر مسلط ہوتی ہے۔ ان میں جوش اور ولولہ ہوتا ہے۔ بات قبول کرتے ہیں تو اس پر ''ہر چہ باداباد' ما کشتی در آب انداختیم'' کہہ کر چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ اور دوسرا طبقہ وہ ہوتا ہے جو دبا ہوتا ہے' پسا ہوتا ہے' اس کے پاؤں میں مفادات کی کوئی بیڑی نہیں ہوتی۔ وہ دعوتِ حق کو اس کی face value پر قبول کرتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ یہی تین طبقات ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے میں پیش قدمی کی۔ یا تو چوٹی کا طبقہ ہے جن کے میں نے نام گنوائے ہیں' لیکن یہ چند ہیں' اگرچہ ان میں سے ایک ایک جو ہے وہ ایک ایک لاکھ کے برابر ہے۔ یا پھر بالکل نوجوان ہیں۔ اور یا پھر وہ طبقہ جو انتہائی دبا ہوا' پسا ہوا' مظلوم و مقہور ہے' جس کا کوئی حق اس معاشرہ میں نہیں تھا' یعنی غلاموں کا طبقہ۔ اس طبقہ میں سے حضرت بلال' ابو وکیع اور خباب بن الارت رضی اللہ عنہم ایمان لائے' لونڈیاں ایمان لائیں' آلِ یاسر رضی اللہ عنہم ایمان لائے۔ اس پر اس فاسد نظام کی طرف سے ردِ عمل کا اظہار ہوا ہے۔ پہلے سے قائم نظام جب یہ دیکھتا ہے کہ ہمارے استہزاء و تمسخر اور چٹکیوں میں اڑانے کی کوششوں سے وہ بات ختم نہیں ہوئی' یہ دعوت تو پیش قدمی کر رہی ہے' آگے بڑھ رہی ہے تو اس کا دوسرا حربہ ہمیشہ تشدد (persecution) کا ہوتا ہے۔

ظاہر بات ہے اس صورت میں سب سے زیادہ پسنے والے یا تو غلام ہوتے ہیں یا نوجوان۔ چنانچہ خباب بن الارت رضی اللہ عنہ کے لیے دہکتے انگارے زمین پر بچھا دیے جاتے اور ننگی پیٹھ پر اُن کو لٹا دیا جاتا کہ باز آ ؤ! بلالِ حبشی رضی اللہ عنہ کو تپتی ہوئی سنگلاخ زمین پر لٹا کر سینے کے اوپر بھی بھاری پتھر رکھ دیا جاتا۔ کبھی گلے میں رسی ڈال کر اوباش نوجوانوں کے حوالے کر دیا جاتا کہ ان کو اندھے منہ مکے کی گلیوں میں گھسیٹتے پھرو۔ لیکن ہر حال میں ان کی زبان سے یہی نکلتا اَحد' اَحد' اَحد۔ ابوجہل نے آلِ یاسرؓ پر ایذا رسانی اور تشدد کی حد کر دی۔ اُس نے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو برچھا مار کر شہید کر دیا اور اس طرح وہ راہِ حق کی

پہلی شہید ٹھہریں۔ ان کا خون راہِ حق میں بہنے والا سب سے پہلا خون ہے۔ ان کے شوہر (حضرت عمارؓ کے والد) حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو اس طرح شہید کیا گیا کہ چار جوان اُونٹ لے کر ان کے ساتھ رسے باندھ دیے گئے اور رسّوں کے دوسرے سروں کے ساتھ حضرت یاسرؓ کے دونوں بازو اور ٹانگیں کس دی گئیں اور پھر اُن اونٹوں کو ایک دم مخالف سمتوں میں دوڑا دیا گیا اور اس طرح اُن کے جسم کے پرخچے اڑ گئے۔ یہ ہے بہیمانہ تشدد جو اس دعوت کو قبول کرنے والوں پر روا رکھا گیا۔

ان حالات میں نبی اکرم ﷺ کے قلبِ مبارک پر کیا بیتتی ہوگی! وہ پیغامِ ربانی جو آپ کو ملتا تھا: ''فَاصْبِرْ'' وہی آپ اپنے جان نثاروں اور ساتھیوں میں بانٹتے گئے۔ آپ سامنے سے گزر رہے ہیں' دیکھ رہے ہیں کہ ابوجہل کیا کر رہا ہے' لیکن اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتے۔ آپؐ کہتے ہیں تو صرف یہ کہ ((صَبْرًا يَا آلَ يَاسِر)) ''اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو اور جھیلو'' ((فَإِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْجَنَّةَ))(۱) ''اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ تم سے جنت کا ہے''۔

پھر یہ نہیں کہ اعلیٰ طبقات کے لوگوں پر تشدد نہ ہوا ہو۔ ان میں سے بالخصوص نوجوانوں پر تشدد ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نوجوان تھے' انہیں ان کے چچا نے ایک چٹائی میں لپیٹا اور دھواں دے دیا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بالکل مادرزاد برہنہ کر کے گھر سے نکال دیا گیا کہ تم نے اگر اپنے آبائی دین کو چھوڑا ہے تو ماں باپ کی کسی چیز پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے' یہ کپڑے بھی انہی کے ہیں' انہیں بھی اُتار دو! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس قدر مارا گیا کہ بالکل مردہ سمجھ کر چھوڑا گیا۔ کہاں اُن کا مرتبہ (status) اور کہاں اُن کا یہ حال!

رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کو شخصی طور پر بھی ایذائیں پہنچائی گئیں۔ آپ ﷺ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ابوجہل نے عُقبہ بن ابی مُعیط سے کہا کہ ذرا جاؤ ان کی خبر

---

(۱) الاصابة لابن حجر العسقلانی: ٦٤٨/٣، راوی: عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما۔
فقه السیرة للالبانی: ١٠٣، راوی: جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما۔

لو۔ اور اُس بدبخت نے چادر کا پھندا بنا کر آپ ﷺ کے گلے میں ڈال کر اسے اس طرح بل دیے کہ آپؐ کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ اسی طرح ایک مرتبہ آپ ﷺ سجدے میں پڑے تھے کہ اسی عقبہ بن ابی معیط نے ابوجہل کے کہنے پر اونٹ کی غلاظت بھری اوجھڑی لا کر آپ ﷺ کے کاندھوں پر رکھ دی' جس کے بوجھ کی وجہ سے آپؐ سر نہ اٹھا پائے۔

ہجرتِ حبشہ

یہ بہیمانہ تشدد سن ۵ نبوی میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تو ہجرت کی اجازت آئی اور ہجرت حبشہ ہوئی۔ اس ہجرت کے لیے دو قافلے نکلے۔ پہلے قافلے میں بارہ مرد اور چار عورتیں شامل تھیں' جن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی تھے اور آپؓ کے ہمراہ آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں جو نبی اکرم ﷺ کی لختِ جگر تھیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: حضرت لوط علیہ السلام اور اُن کی بیوی کے بعد یہ پہلا جوڑا ہے جو راہِ خدا میں ہجرت کر رہا ہے۔ دوسرا قافلہ جو ۸۳ مردوں اور ۱۸ عورتوں پر مشتمل تھا' حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی قیادت میں روانہ ہوا۔ کم و بیش اتنے ہی لوگ ہوں گے جو مکہ میں رہ گئے ہوں گے۔ یہ تھی رسول اللہ ﷺ کی پانچ برس کی کمائی! تشدد اور ایذا رسانی کے باوجود ان پانچ برسوں میں دعوت کا قدم پیچھے نہیں ہٹا' بلکہ بتدریج آگے بڑھتا رہا۔ اور یہ دعوت تھی قرآن کی اور اس کی تعلیم کی۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (۱)

حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ کا قبولِ اسلام

سن ۶ نبوی میں کچھ پانسا پلٹتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایمان لے آئے' حضرت

(۱) ''نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت!'' کے عنوان سے میرا ایک کتابچہ موجود ہے جس میں یہ تین نکات میں نے اپنی امکانی حد تک واضح کیے ہیں: (۱) نبوت کا بنیادی مقصد کیا ہے' (۲) ختم نبوت کے لوازم کیا ہیں' (۳) آنحضور ﷺ کے انقلاب کا بنیادی طریق کار کیا ہے۔ اس کتابچہ کا ضرور مطالعہ کیجیے۔ اور چونکہ ان تین نشستوں میں یہی باتیں سامنے آئی ہیں لہٰذا اس وقت اسے پڑھیں گے تو وہ آسانی سے سمجھ میں آئے گا۔

حمزہ رضی اللہ عنہ ایمان لے آئے۔ اس سے مسلمانوں کو بھی کچھ حوصلہ ہوا۔ حضرت عمرؓ کے ایمان لانے میں حضرت خباب بن الارتؓ کا بڑا دخل ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ اپنی ہمشیرہ فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا کے گھر پر گئے اور دستک دی تو خباب بن الارت رضی اللہ عنہ ان کو اور ان کے شوہر حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کو قرآن پڑھا رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر اپنی بہن اور بہنوئی کو مارنا شروع کر دیا۔ لیکن ان کی استقامت دیکھ کر خود ڈگمگا گئے۔ اُن سے قرآن مجید لے کر خود پڑھنا شروع کیا تو دل پر شدید اثر ہوا اور حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔

حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما کا ایمان ایک طرف تو مسلمانوں کے لیے موجب تقویت ہوا' دوسری طرف سردارانِ قریش بھی چونکے کہ یہ مشتِ خاک تو ایک بہت بڑا طوفان بن رہی ہے' لہٰذا یہ وہ وقت ہے جب جناب ابوطالب کو ایک طرح کا الٹی میٹم دے دیا گیا۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ قبائلی نظام میں شرافت کی بنیاد یہ تھی کہ اپنے قبیلے کے فرد کا ساتھ نہ چھوڑا جائے اور ابوطالب نے بہرحال اس شرافت کا ثبوت دیا۔ بنی ہاشم کی سیادت اب ابوطالب کے پاس تھی اور قریش محمد رسول اللہ ﷺ پر کوئی وار کرنے سے اس لیے ڈرتے تھے کہ اس طرح قبائلی جنگ چھڑ جائے گی' پورے بنی ہاشم کے ساتھ تصادم مول لینا پڑے گا' کیونکہ محمد ﷺ بنی ہاشم کے چشم و چراغ تھے۔ لہٰذا جناب ابوطالب کو الٹی میٹم دیا گیا کہ اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے' یا تو راستے سے ہٹ جاؤ یا میدانِ جنگ میں آؤ۔ اُس وقت ابوطالب نے آپ ﷺ کو بلایا اور کہا کہ بھتیجے! مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جسے میں برداشت نہ کر سکوں۔

شِعبِ بنی ہاشم کی محصوری

اب ذرا چشمِ تصور سے دیکھئے' دنیاوی سہارا اسی ایک خاندان کا تھا (اصل سہارا تو اللہ تعالیٰ کا ہے' میں نے اسی لیے ''دنیاوی سہارا'' کہا ہے) اور نبی اکرم ﷺ کو محسوس ہوا کہ اب یہ سہارا بھی ہٹ رہا ہے تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن آپؐ نے پوری استقامت کے ساتھ فرمایا: چچا جان! یا تو یہ بات پوری ہو کر رہے گی یا میں اپنے آپ کو

ہلاک کر دوں گا۔ اس پر چچا کے بھی آنسو نکل آئے۔ ان کی فطری و طبعی محبت جاگی اور انہوں نے آپ ﷺ کی حمایت برقرار رکھی۔ چنانچہ سردارانِ قریش کی طرف سے طے کر دیا گیا کہ بنی ہاشم کا مکمل سماجی اور معاشی بائیکاٹ کر دیا جائے' ان کے ساتھ کوئی لین دین نہیں ہوگا' اُن کے ہاتھ نہ کوئی چیز بیچی جائے گی نہ اُن سے خریدی جائے گی۔ مجبور ہو کر وہ شعبِ ابی طالب (یا شعبِ بنی ہاشم) کے اندر محصور ہو گئے' جہاں کوئی چیز اندر نہیں جا رہی تھی۔ تین برس (سن ۷' ۸' ۹ نبوی) تک یہی صورتِ حال رہی۔ بچے بھوک پیاس سے بلکتے رہے۔ کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ اس گھاٹی میں اگر کوئی جھاڑی تھی تو اس کے سب پتے کھا لیے گئے۔ کبھی کوئی ہمت کرتا تو رات کے وقت چوری چھپے کچھ پہنچا دیتا' ورنہ وہ وقت بھی آیا کہ سوکھا چمڑا اُبال کر اُس کا پانی بلکتے ہوئے بچوں کے حلق میں ٹپکا دیا گیا۔ یہ ہیں وہ مراحل جو پیش آئے۔ میں پھر کہوں گا کہ یہ سب کچھ انسانی سطح پر ہو رہا ہے' سب کچھ جھیل کر' سب کچھ برداشت کر کے ہو رہا ہے۔ ع ''اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری!'' اللہ اگر چاہتا تو اپنے حبیب ﷺ کے پاؤں میں ایک کانٹا بھی چبھنے نہ دیتا' لیکن پھر مجھ پر اور آپ پر حجت کیسے قائم ہوتی؟ بہرحال تین سال کے بعد کچھ لوگوں کے اندر انسانیت کی دبی ہوئی چنگاری جاگی اور مقاطعہ کا جو معاہدہ تھا اسے پھاڑ پھینکا۔ اس طرح بنی ہاشم کی محصوری کا دَور ختم ہوا۔

امتحانات کا تسلسل

یہ ۱۰ نبوی کا زمانہ ہے۔ جب استہزاء و تمسخر اور چٹکیوں میں اڑانے کی کوششوں کے بعد تشدد اور ایذا رسانی کا حربہ بھی ناکام ہو گیا تو اب تیسرا حربہ لالچ (temptation) کا آزمایا گیا اور مصالحانہ انداز میں سفارتیں آنے لگیں۔ اب پھر ابوطالب کے پاس سفارت آئی کہ اپنے بھتیجے سے کہو کہ جو مانگنا ہے مانگ لے' لیکن اس دعوت سے باز آ جائے! بادشاہ بننا چاہتا ہے تو بادشاہ بنا دیتے ہیں' اگر کسی گھرانے میں شادی کرنی ہے تو اشارہ کرے' ہم شادی کرا دیتے ہیں' دولت چاہیے تو سیم و زر کے انبار اس کے

قدموں میں لگا دیتے ہیں۔ چچا نے پھر بلایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: چچا جان! اگر یہ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند رکھ دیں تب بھی مَیں اپنی اس دعوت کو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔

دیکھئے' امتحانات کا یہ سلسلہ کس طرح چل رہا ہے۔ شعبِ بنی ہاشم کی سختی ختم ہوئی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اور امتحان آیا۔ ۱۰ نبوی کو اللہ کے رسول ﷺ نے عام الحُزن (غم واندوہ کا سال) قرار دیا ہے۔ اس سال کے دوران جناب ابوطالب کا بھی انتقال ہو گیا اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا بھی رحلت فرما گئیں۔ اس طرح گھر کے اندر کا رفیق' ہمت بندھانے والا ساتھی' دلجوئی کرنے والی رفیقۂ حیات اور اُدھر خاندانی اور قبائلی سطح پر حامی و پشت پناہ شخصیت ایک ہی سال میں دونوں انتقال کر گئے۔

ذاتی مصائب کا نقطۂ عروج

ان حالات میں قریش کے سرداروں کا حوصلہ جوان ہو رہا ہے' دارالندوہ میں بیٹھ کر مشورے ہو رہے ہیں' قتل کے منصوبے بن رہے ہیں کہ اب قصہ چکا دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ بھی حالات کے نتیجے کو دیکھ رہے ہیں۔ مکہ میں تو اب کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا' آپؐ ایک کوشش کرتے ہیں کہ شاید طائف میں اللہ تعالیٰ کسی بڑے سردار کو اس بات کی توفیق دے دے کہ وہ میری رفاقت اختیار کرے۔ چنانچہ ۱۰ نبوی میں آپ ﷺ نے پاپیادہ طائف کا سفر اختیار کیا' صرف زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آپؐ کے ساتھ تھے۔ یہ وہ سفر ہے کہ جس میں سائے کی طرح ساتھ رہنے والے ساتھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی ساتھ نہ تھے۔ چونکہ مکہ میں آپؐ کے قتل کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اہل مکہ کی جانب سے ضرر کا اندیشہ تھا' لہٰذا آپؐ نے عام راستہ چھوڑ کر بڑا دشوار گزار پہاڑی راستہ اختیار کیا۔ طائف پہنچ کر ایک رئیس سے ملے۔ اُس نے بڑا ہی جگر سے پار ہو جانے والا جملہ کہا: ''میں تم سے بات ہی کرنا نہیں چاہتا۔ تم اگر جھوٹے ہو تو اس قابل نہیں کہ تمہیں منہ لگایا جائے اور اگر تم سچے ہو تو خطرہ ہے کہ اگر مَیں نے تمہاری توہین کر دی تو مجھ پر عذاب آ جائے گا''۔ آپ ﷺ یکے بعد دیگرے تین سرداروں سے ملے' تینوں نے ایسے ہی

جواب دیے۔ اب وہ طائف کی گلیاں ہیں اور رحمۃٌ للعالمین ہیں۔ سید الاوّلین والآخرین اور محبوب ربّ العالمین کے ساتھ عالمِ واقعہ میں ہو کیا رہا ہے! طائف کی گلیوں میں اوباش لوگوں کو پیچھے لگا دیا گیا ہے کہ ذرا اِن کی خبر لو۔ تاک تاک کر ٹخنے کی ہڈی کا نشانہ لے کر پتھر مارے جاتے ہیں۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے جسم اطہر سے خون جاری ہے' نقاہت طاری ہو گئی ہے۔ ایک جگہ بیٹھ گئے ہیں تو دو غنڈے آئے ہیں' ایک نے اِدھر سے بغل میں ہاتھ ڈالا اور دوسرے نے اُدھر سے اور کھڑا کر دیا کہ چلو! یہ ہے وہ کس پرسی' یہ ہے وہ نقشہ کہ ؎

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری
تنہا پسِ زنداں' کبھی رُسوا سرِ بازار!

مکہ میں تین سال کی قید کے بعد طائف کی یہ رسوائی! یہ نقطۂ عروج ہے رسول اللہ ﷺ کے ذاتی مصائب کا۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک دفعہ مدنی دَور میں سوال کیا کہ آپؐ پر یومِ اُحد سے زیادہ سخت دن بھی کوئی آیا ہے؟ (اُن کے اپنے شعور کی عمر میں یومِ اُحد سب سے زیادہ سخت دن تھا۔) آپؐ نے فرمایا کہ ہاں' طائف کا دن! اُحد کے دن تو آگے پیچھے آپ ﷺ کے جان نثار تھے جنہوں نے اپنے سینے ڈھال بنائے ہوئے تھے۔ لیکن یہاں معاملہ یہ تھا کہ یکہ و تنہا تھے۔ غلام کی تو اُس معاشرے میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ یہ حالت درحقیقت رسول اللہ ﷺ کی ذاتی مصیبت کا نقطۂ عروج ہے۔

جب رسول اللہ ﷺ طائف سے واپس آئے تو تھوڑی دیر کے لیے ایک جگہ پر بیٹھے۔ طبیعت بھر آئی' جذبات اُمڈے۔ اُس وقت آپؐ نے جو دعا مانگی ہے اور مناجات کی ہے' وہ کلیجے میں شگاف ڈال دینے والی ہے۔ دعا یہ ہے:

((اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ ' وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ ' وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ ' اَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ ' اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ وَاَنْتَ رَبِّیْ' اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ؟ اِلٰی بَعِیْدٍ یَتَجَھَّمُنِیْ اَمْ اِلٰی عَدُوٍّ مَّلَّکْتَہٗ اَمْرِیْ؟ اِنْ لَمْ یَکُنْ بِکَ غَضَبٌ عَلَیَّ فَلَا اُبَالِیْ' غَیْرَ اَنَّ عَافِیَتَکَ ھِیَ اَوْسَعُ لِیْ' اَعُوْذُ بِنُوْرِ

وَجْهِكَ الَّذِيْ اَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ وَصَلُحَ عَلَيْهِ اَمْرُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ اَنْ يَحِلَّ عَلَيَّ غَضَبُكَ اَوْ يَنْزِلَ بِيْ سَخَطُكَ ' لَكَ الْعُقْبٰى حَتّٰى تَرْضٰى ' وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِكَ)) (۱)

''اے اللہ! میں تیری ہی جناب میں شکایت لے کر آیا ہوں اپنی قوت کی کمی اور اپنے وسائل و ذرائع کی قلت کی اور لوگوں میں جو رسوائی ہو رہی ہے' اُس کی۔ تو ارحم الراحمین ہے' تو کمزوروں کا ربّ ہے اور میرا بھی ربّ ہے۔ مجھے کس کے حوالے کر دیا ہے؟ مجھے غیر کے حوالے کر دیا ہے کہ جس طرح چاہے ستائے' یا میرا معاملہ دشمن کے حوالے کر دیا ہے کہ جو چاہے کر گزرے؟ (اس سب کے باوجود) اے اللہ! اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے (اور تیری رضا اسی میں ہے) تو مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ البتہ تیری بخشش میرے لیے وسیع تر ہے۔ میں تیرے رُخِ انور کی ضیا کی پناہ میں آتا ہوں' جس سے ظلمات منور ہو جاتے ہیں اور میرے دنیا و آخرت کے معاملات سدھر جاتے ہیں' اس بات سے کہ مجھ پر تیری ناراضی یا غصہ ہو۔ پروردگار! انجام کار تیرے ہی ہاتھ میں ہے' یہاں تک کہ تیری مرضی پوری ہو۔ کوئی قوت و تدبیر تیری مدد کے بغیر کارگر نہیں ہو سکتی۔''

یہ ہے اصل میں وہ مقام جس کی طرف سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝﴾

''پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم یونہی جنت میں چلے جاؤ گے' حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا جو تم سے پہلے (ایمان لانے والے) لوگوں پر گزر چکا ہے؟ اُن پر سختیاں گزریں' مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے' حتیٰ کہ رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ (اُس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ) ہاں اللہ کی مدد یقیناً قریب ہے!''

(۱) یہ دعا حدیث و سیرت کی متعدد کتابوں میں الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔ علامہ ناصر الدین البانیؒ نے اسے فقہ السیرۃ (ح ۱۲۶) میں محمد بن کعب القرظی کی روایت سے اور ضعیف الجامع الصغیر (ح ۱۱۸۲) میں عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب کی روایت سے بحوالہ طبرانی نقل کیا ہے۔ (مرتب)

ایک وقت آتا ہے کہ رسول پکار اٹھتا ہے کہ اے اللہ! تیری مدد کب آئے گی؟ سورۂ یوسف (آیت ۱۱۰) میں بھی آیا ہے:

﴿حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا.....﴾

''یہاں تک کہ جب پیغمبر (لوگوں سے) مایوس ہو گئے اور (لوگوں نے بھی) یہ سمجھ لیا کہ اُن سے جھوٹ بولا گیا تھا تو یکا یک ہماری مدد پیغمبروں کو پہنچ گئی.....''

ایک وقت آتا ہے کہ بالکل مایوسی کا اندھیارا ہوتا ہے' کہیں کوئی اُمید کی کرن نظر نہیں آتی کہ کدھر جاؤں' سارے راستے بند نظر آتے ہیں' اُس وقت رسول پکارتا ہے تو اللہ کی مدد آ پہنچتی ہے۔ جیسے حضرت نوح علیہ السلام نے صدا بلند کی تھی: ﴿اَنِّىْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝۱۰﴾ (القمر) ''پروردگار! میں مغلوب ہوا چاہتا ہوں' تو مدد فرما!'' پھر مدد آتی ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی معاملہ ہوا۔ چنانچہ ملک الجبال آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے کہ مجھے اللہ نے بھیجا ہے' اگر آپؐ چاہیں تو ان پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا دیا جائے اور طائف کے رہنے والے ان کے درمیان سرمہ بن جائیں۔ آپؐ نے فرمایا: نہیں! کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسلوں کو توفیق دے دے۔ چنانچہ خدا نے واقعۃً ان کی نسلوں کو توفیق دی۔ اس صنم کدۂ ہند میں توحید کا پیغام لانے والے محمد بن قاسمؒ بنوثقیف سے ہی تھے' یعنی طائف کے رہنے والوں کی اولاد۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے ایک بات لکھی ہے کہ طائف کا دن رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ایک فیصلہ کن موڑ (turning point) ہے۔ اُس دن تک گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو لوگوں کے حوالے کیا ہوا تھا کہ ہمارے نبی سے جو چاہو کر لو' تمہیں کھلی چھوٹ ہے' جس طرح چاہو انہیں ستا لو اور جس طرح چاہو آزما لو' ان کے صبر اور ان کی استقامت کا امتحان لے لو! چنانچہ دس سال تک کوئی بھی مافوق الفطرت رکاوٹ یا مدد نہیں آئی۔ ذہن میں رکھیے یہ ۱۰ نبوی ہے۔ گویا رسول اللہ ﷺ دس سال تک اس کیفیت سے دوچار رہے کہ اللہ کی کوئی غیبی مدد نہیں آئی اور جو بھی اس دنیا کا دستور ہے اُسی کے مطابق زمین پر قدم بہ قدم چل کر جو بھی مسائل پیش آتے ہیں' جو بھی ناکامیاں ہوتی ہیں' جو بھی رسوائیاں ہوتی ہیں' جو بھی الزامات لگتے ہیں' جو استہزاء اور تمسخر ہوتا ہے' جس طرح ستایا

جاتا ہے' وہ سب کچھ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہوا۔ لیکن ہر چیز اپنے عروج (climax) کو پہنچ کر اب anti climax پر آ گئی۔ طائف کا دن رسول اللہ ﷺ کے لیے اس اعتبار سے فیصلہ کن موڑ ہے کہ گویا وہ آخری حد آ پہنچی اور اب آپ ﷺ کو اللہ کی طرف سے خصوصی تحفظ حاصل ہو گیا۔

طائف سے آپ ﷺ واپس مکہ آئے' مگر داخلہ ممکن نہیں تھا۔ مکہ سے تو گئے اسی لیے تھے کہ یہاں قتل کے فیصلے ہو رہے تھے۔ دُنیوی اعتبار سے بے نیلِ مرام واپس آئے ہیں' کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ مکہ میں تو کوئی ایسا دن آیا بھی نہیں تھا جو طائف میں آیا۔ رسول اللہ ﷺ مکہ سے باہر رہے اور مُطعَم بن عَدی کو پیغام بھیجا کہ مجھے اپنی پناہ میں لے لو تو مَیں مکہ میں داخل ہو جاؤں۔ اُس نے کہہ دیا ہاں ٹھیک ہے' آپ میری پناہ میں ہیں! فرمایا یوں نہیں' خود آ کر لے جاؤ۔ وہ شخص اپنے چھ بیٹوں کو ساتھ لے کر ہتھیار بند ہو کر آیا اور آپ ﷺ کو ساتھ لے کر گیا' ورنہ محمد رسول اللہ ﷺ کا مکہ میں داخلہ ممکن نہ تھا۔ (مطعم بن عدی ایک شریف النفس انسان تھا۔ وہ شخص ایمان نہیں لایا' لیکن ہم سب کی گردنوں پر اس کا احسان ہے کہ اُس نے نبی کریم ﷺ کو پناہ دی۔) لیکن اب پانسا پلٹتا ہے۔

خدائی تدبیر میں مدینہ منورہ کا انتخاب

۱۱ نبوی میں مدینہ منورہ سے ٹھنڈی ہوائیں آئیں۔ موسم حج ہے' حاجیوں کے پڑاؤ لگے ہوئے ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ دعوت و تبلیغ کے لیے کبھی اِس کیمپ میں اور کبھی اُس کیمپ میں تشریف لے جا رہے ہیں۔ ابھی یہاں حاجیوں کے کسی قافلے کے پاس ہیں اور ابھی وہاں۔ ایک گھاٹی میں اچانک یثرب سے آنے والے چھ حاجیوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ آپ ﷺ اپنی دعوت پیش کرتے ہیں۔ اس پر وہ کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ اِن کنکھیوں میں پوری تاریخ مضمر ہے۔ یثرب میں یہود کے تین قبیلے آباد تھے۔ یہودی اپنے علم کی بنیاد پر' اپنی کتابوں اور اپنے صحیفوں کی بنیاد پر اِن کو خبر دیا کرتے تھے کہ آخری نبی کے ظہور کا وقت آ گیا ہے اور انہیں دھمکایا کرتے تھے کہ اب

تو تم ہمیں دبا لیتے ہو' تم ہم پر غالب آ جاتے ہو' لیکن کوئی بات نہیں' آخری نبیؐ کے ظہور کے بعد جب ان کے ساتھ ہو کر ہم تمہارے خلاف جہاد کریں گے تو ہم تم پر غالب ہو جائیں گے۔ یثرب سے آئے ہوئے حاجیوں نے دیکھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی نبی ہیں' جلدی کرو' ایمان لے آؤ' مبادا یہود سبقت کر جائیں۔ ذرا سوچیے' یہود کا علم اہلِ یثرب کو تو فائدہ دے رہا ہے اور خود یہود کے لیے وہ حجاب بن گیا۔ وہ چھ حضرات ایمان لے آئے اور ایک کھڑکی کھل گئی۔ اب تک پورا ماحول بند تھا' کہیں راستہ نہیں نکل رہا تھا۔ یہاں یہ نکتہ ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ خالص خدائی تدبیر ہے' اس میں آنحضورﷺ کی اپنی تدبیر کا کوئی دخل نہیں۔ آپﷺ کی ساری سعی و جُہد آج تک مکے میں ہوئی اور مکے سے باہر سوچا بھی تو طائف کا سوچا۔ آپﷺ نے ایک سفر اور بھی کیا تھا اور وہ بھی اسی طرح ناکام رہا تھا۔ یہ خالص خدائی تدبیر تھی کہ مدینے کے چھ افراد ایمان لے آئے۔

اگلے سال (۱۲ نبوی میں) بارہ آدمیوں نے آ کر بیعت کی' اور درخواست کی کہ اب ہمارے ساتھ کوئی ایسا آدمی بھیج دیجیے جو ہمیں قرآن مجید پڑھائے۔ یہ بیعت' بیعت عقبۂ اولیٰ کہلاتی ہے۔ پھر نوٹ کر لیجیے' رسول اللہﷺ کی دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کی بنیاد قرآن ہے۔ یہ اس انقلاب کا انفراسٹرکچر ہے' اور اس عظیم الشان عمارت کی اصل مضبوطی اسی سے ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے:

خدا کے کام دیکھو' بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!

تو اصل اہمیت اس جڑ اور بنیاد کی ہے۔ چنانچہ بیعتِ عُقبہ اولیٰ کرنے والے بارہ حضرات نے کہا کہ ہمیں ایک شخص دیجیے جو ہمیں قرآن پاک پڑھائے۔ قرعۂ فال حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے نام نکلا۔ یہ بڑے ناز و نعم میں پلے ہوئے نوجوان تھے۔ ان کے لیے دو دو سو درہم کا جوڑا شام سے تیار ہو کر آتا تھا۔ عطر کی پوری پوری شیشیاں جسم پر انڈیل کر نکلتے تھے۔ مکے کی گلیوں میں لوگ دیکھتے تھے کہ کون جا رہا ہے! انتہائی خوش پوش' خوش شکل' خوش مذاق' خوش لباس تھے۔ ان کا ذکر پہلے گزر چکا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے

بعد چچا نے ان کے تن کے کپڑے تک اتروا لیے تھے اور گھر سے نکال دیا تھا۔ ان کو ساتھ کر دیا گیا اور وہ مدینہ منورہ میں قرآن کی تعلیم دینے لگے۔ مدینہ میں اُن کا نام المُقری یعنی قرآن پڑھانے والا پڑ گیا تھا۔

ایک سال تک حضرت مصعبؓ نے محنت کی اور اگلے سال بہتر (۷۲) مرد اور تین عورتوں نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ ۱۳ نبوی کا واقعہ ہے۔ اس بیعت میں یہ طے ہوا کہ آپؐ ہمارے ہاں آ جائیے' ہم آپ کی حفاظت کریں گے۔ اُس وقت جو کچھ قول و قرار ہوا اُس پر بعض کہنے والوں نے کہا: اے یثرب والو! خوب سمجھ لو' خوب سوچ لو کہ کیا قول و قرار کر رہے ہو! محمد رسول اللہ ﷺ کو ساتھ لے کر جانا سرخ و سیاہ آندھیوں کو دعوت دینا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھی خوب سمجھ سوچ کر معاملہ کیا اور کہا کہ ہم آپ کی اس طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں۔ یہ ہے بیعتِ عقبۂ ثانیہ جو ہجرت کی تمہید بنی ہے۔

ہجرتِ مدینہ کا فیصلہ

اس کے بعد حکمِ خداوندی آیا اور ہجرت کا فیصلہ ہوا۔ اِدھر اہلِ مکہ کی مخالفت نقطۂ عروج پر پہنچ چکی ہے۔ دار الندوہ میں آپ ﷺ کے قتل کے فیصلے کے بعد پورا نقشہ بن چکا ہے کہ قریش کے جتنے گھرانے ہیں اُن سب میں سے ایک ایک فرد قتل میں شریک ہو' اس لیے کہ بنی ہاشم چوکھی لڑائی تو نہیں لڑ سکیں گے' کس کس سے قصاص طلب کریں گے؟ ہر گھرانے کا ایک ایک شخص جمع ہو اور رات کی تاریکی میں پل پڑو۔ یہ بھی تعین نہ ہو سکے کہ محمد (ﷺ) کس کی تلوار سے قتل ہوئے۔ یوں سمجھئے کہ قبائلی زندگی کے تمام معاملات و مسائل کو پیشِ نظر رکھ کر مکمل منصوبہ بندی کی گئی اور رات کو محمد رسول اللہ ﷺ کے گھر کا محاصرہ کر لیا گیا۔ اس محاصرے کے باوجود محمد رسول اللہ ﷺ نکلے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی حفاظت تھی جو نظر نہیں آتی۔ غارِ ثور میں تین دن رہے ہیں اور ڈھونڈے نہ جا سکے' اگرچہ کھوجی تلاش کرنے والوں کو عین غار کے دہانے تک لے گیا ہے۔ کھوج لگانے والے بھی غضب کے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ سیدھا مدینے کا

رُخ کرنے کی بجائے بالکل دوسری طرف سے گئے ہیں جو بڑا دشوار گزار راستہ ہے۔ بارہ میل کی بڑی ہی سخت چڑھائی ہے' اور وہاں جا کر آپؐ نے غارِ ثور میں روپوشی اختیار کی ہے' لیکن پہنچنے والے وہاں بھی پہنچ گئے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی ایک دفعہ گھبرا گئے کہ حضور ﷺ! ان میں سے کسی نے اگر غیر اختیاری طور پر بھی اپنے قدموں کی طرف دیکھ لیا تو ہم پکڑے جائیں گے۔

یہاں اُس یقین نبوت کا اظہار ہوتا ہے' جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿٦٢﴾﴾ (الشُّعراء) ''نہیں' میرے ساتھ میرا ربّ ہے' وہ میرے لیے راستہ نکال دے گا!'' یہاں آپ ﷺ نے ثانی اثنینؓ سے فرمایا: ﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ (التوبۃ: ٤٠) ''غم نہ کرو' اللہ ہمارے ساتھ ہے!'' وہاں سے تین دن کے بعد نکلے ہیں۔ پھر بھی تعاقب جاری ہے۔ اعلان کر دیا گیا ہے کہ محمد کو زندہ پکڑ لاؤ یا ان کا سر لے آؤ اور سو اونٹ لے لو! سو اونٹوں کا اعلان بہت بڑا اعلان ہے۔ سراقہ نے دوڑ لگائی ہے' پہنچ بھی گیا ہے' لیکن جب قریب پہنچتا ہے تو اُس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس جاتے ہیں۔ پھر توبہ کرتا ہے' باز آتا ہے' لیکن پھر وہ لالچ نظر آتا ہے تو پھر دوڑ لگا دیتا ہے۔ تین مرتبہ پاؤں دھنستے ہیں۔ یہ ہے وہ نصرت وحمایتِ خداوندی' اِس کا انکار نہیں ہے۔ لیکن اصل بات یہ سمجھنے کی ہے کہ تائیدِ غیبی کب آتی ہے' اللہ تعالیٰ کی مدد کب آتی ہے! جبکہ انسان اپنے صبر وثبات سے' اپنی محنت سے' اپنے استقلال سے ثابت کر دیتا ہے کہ وہ اللہ کی مدد کا حقدار ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد کا دس سال کا عرصہ سامنے رکھیے' اس کے بعد یہ راستہ کھلا ہے۔ کیسے کیسے امتحان اور کیسی کیسی آزمائشیں اور کیسی کیسی ناکامیاں پیش آئی ہیں! یومِ طائف کی دعا کو ایک دفعہ پھر ذہن میں تازہ کیجیے' جو جگر کو چھید دینے والی دعا ہے۔ بہرحال رسول اللہ ﷺ کی اس انقلابی جدوجہد کا یہ خلاصہ اور لب لباب ہے جو آج بیان کیا گیا ہے۔ اگلی نشست میں سیرت النبی ﷺ کے مدنی دَور پر گفتگو جاری رہے گی۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

سلسلۂ خطبات ④

حیاتِ طیّبہ کا مدنی دَور

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ ﴿۳۹﴾ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۴۰﴾ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾﴾ (الحج)..... صدق اللہ العظیم

گزشتہ نشست میں ہم نے نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے اس دَور پر جو اجرائے وحی سے شروع ہوا اور ہجرت پر ختم ہوا' اور اس کے کچھ اہم واقعات اور اُن مراحل پر جن سے ان تیرہ سالوں میں دعوتِ نبویؐ گزری تھی' غور کیا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ مکہ مکرمہ میں حالات بالکل ہی مایوس کن ہو چکے تھے' اُمید کی کوئی کرن کسی طرف سے نظر نہ آتی تھی' یہاں تک کہ آنحضور ﷺ خود دل برداشتہ ہو کر طائف تشریف لے گئے تھے' لیکن وہاں سے دُنیوی اعتبار سے ناکام لوٹنا پڑا۔ اس کے بعد از خود ایک کھڑکی کھل گئی۔ مدینہ منورہ سے چھ افراد ۱۱ نبوی میں ایمان لائے' ۱۲ نبوی میں وہ بارہ ہو گئے' جبکہ ۱۳ نبوی میں یہ تعداد ۷۲ تک پہنچ گئی۔ یوں مدینہ منورہ میں ابھی نبی مکرم ﷺ کے قدم مبارک پہنچے بھی نہیں تھے اور وہاں آپؐ کی دعوت کامیابی کے مراحل طے کرنے لگی۔ یہ آپؐ کے ایک

جاں نثار حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی ایک سالہ تبلیغ کا نتیجہ تھا۔

اس ضمن میں مَیں نے عرض کیا تھا کہ اس میں کسی انسانی کوشش کو دخل نہیں' یہ خالص خدائی تدبیر ہے۔ میں اس بات کی قدرے وضاحت کرنا چاہتا ہوں' اس لیے کہ یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ ایک طرف تو یہ بات جان لیجیے کہ انسان اُس وقت تک کچھ نہیں کر سکتا جب تک اللہ نہ چاہے۔ لیکن دوسری طرف اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ انسانی کوشش اور سعی و جہد کی سرے سے کوئی اہمیت نہیں۔ حقیقت ان دونوں کے بَین بَین ہے۔ مَیں اگر یہ سمجھوں کہ مَیں محض اپنے ارادے سے اپنے ہاتھ کو جنبش دے سکتا ہوں تو یہ بھی شرک ہو جائے گا۔ یہ شرک فی القدرۃ اور شرک فی الارادہ ہے۔ قدرت اور ارادہ صرف اللہ کا ہے کہ وہ جو چاہے کر گزرے' وہ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ہے۔ ماسوائے اللہ کے لیے محض اپنے ارادے سے اپنی انگلی تک کو حرکت دینا ممکن نہیں۔ چنانچہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جو مساعی نبی اکرم ﷺ نے فرمائیں اور آپؐ کے ساتھیوں نے جو محنتیں کیں' جو مشقتیں اٹھائیں' جس طرح جان و مال کو کھپایا' یہ اپنی جگہ مسلّم ہے' اس کی نفی نہیں ہو گی۔ اور اسی سے درحقیقت ہم پر اتمامِ حجت ہوتی ہے۔ ہر طرح کے حالات میں کوشش کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے' لیکن یہ کہ کون سی کوشش کس وقت بارآور ہو' اس کا فیصلہ کلیۃً اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ان دونوں باتوں کو بیک وقت پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری

مدینہ منورہ کو دارالہجرت بننے کا شرف حاصل ہوا۔ نبی اکرم ﷺ ۸ ربیع الاوّل ۱۳ نبوی کو قبا میں تشریف آور ہوئے اور تقریباً دو ہفتے آپؐ نے وہاں قیام فرمایا۔ وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مسجد کی بنیاد رکھی' جو ''مسجد قبا'' کے نام سے معروف ہے۔ سورۃ الحج کی آیت ۴۱ ملاحظہ ہو:

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ﴾

''وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں زمین میں غلبہ و اقتدار عطا فرمائیں تو وہ نماز قائم کریں

گے‘ زکوٰۃ دیں گے‘ نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔‘‘

غور فرمائیے کہ اس غلبے اور تمکن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ چنانچہ اگر مشیتِ خداوندی نہ ہوتی اور مدینہ میں یہ صورتِ حال پیدا نہ ہوتی تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ حالات کا رُخ کیا ہوتا! مشیتِ خداوندی کو اس میں فیصلہ کن دخل حاصل ہے۔ دوسری بات یہ نوٹ کیجیے کہ اس آیۂ مبارکہ کے مطابق اللہ کی طرف سے غلبہ و اقتدار ملنے کے بعد اہل ایمان کا پہلا کام اقامتِ صلوٰۃ ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے ہجرت کے بعد سب سے پہلے مسجد کی بنیاد رکھی۔ مدینہ منورہ پہنچنے پر بھی آپ ﷺ نے سب سے پہلے مسجدِ نبویؐ کی تعمیر کا اہتمام فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمکن فی الارض عطا ہونے کے بعد اب بعثتِ محمدی ﷺ کے تکمیلی مرحلے یعنی غلبہ و اقامتِ دین کے لیے براہِ راست اقدام کا آغاز ہو گیا۔

مدینہ منورہ کا تمدنی پس منظر

مدینہ منورہ کے بارے میں یہ جان لیجیے‘ جیسا کہ مَیں نے پہلے بھی اشارۃً عرض کیا تھا‘ کہ تمدنی اعتبار سے وہ مکہ معظمہ سے ایک قدم آگے تھا۔ مکہ میں صرف ایک قبیلہ آباد تھا‘ جبکہ مدینہ میں پانچ بڑے اہم اور طاقتور قبیلے آباد تھے۔ یعنی مکہ میں اجتماعی زندگی ابھی قبائلی سطح پر تھی‘ لیکن مدینہ میں ایک شہری ریاست قائم تھی۔ پانچ قبیلوں نے مل جل کر باہم کچھ اصول طے کر کے وہاں ایک چھوٹی سی ریاست قائم کر لی تھی۔ ان میں دو قبیلے اوس اور خزرج اصل عرب قبیلے تھے‘ جن کی حیثیت گویا مالکانِ دیہہ کی تھی۔ ان کے علاوہ تین اور قبائل یہود کے تھے‘ جن کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ کب اور کیوں یہاں آ کر آباد ہوئے۔ البتہ ایک گمان ہے کہ یہ لوگ درحقیقت یہاں اس پیشین گوئی کی بنیاد پر آئے تھے کہ آخری نبی کا ظہور کھجوروں کے جھنڈ رکھنے والی سرزمین میں ہوگا۔ اسی پیشین گوئی کی بنیاد پر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو راہنمائی ملی تھی۔ ایک عیسائی راہب نے اُن سے کہا تھا کہ میرا علم یہ بتاتا ہے کہ اب نئی نبوت کے ظہور کا وقت قریب ہے اور اس کا ظہور کھجوروں کی سرزمین میں ہوگا‘ چنانچہ انہوں نے ادھر کا سفر اختیار کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ

یہود کے قبائل اسی اُمید میں یثرب آئے تھے کہ تورات کی پیشین گوئیوں کے مطابق اس سرزمین میں آخری اور کامل نبوت کا ظہور ہونے والا تھا۔ واللہ اعلم!

جیسا کہ میں نے عرض کیا ان پانچ قبائل میں سے دو یعنی اوس اور خزرج تو گویا مالکانِ دیہہ تھے' اور یہود کے متعلق یوں سمجھ لیجیے کہ یہ ساہوکاروں کے تین خاندان تھے' جو وہاں آباد تھے۔ خزرج کا قبیلہ بڑا تھا اور اوس کا چھوٹا۔ اُن کے مابین اکثر خانہ جنگی رہتی تھی اور یہودیوں کو موقع ملتا تھا کہ کبھی ایک اور کبھی دوسرے قبیلے کا ساتھ دے کر رفتہ رفتہ مدینہ منورہ پر اپنا تسلط اور اپنی گرفت مضبوط کرتے جائیں۔ یہاں تک کہ یہ اوس و خزرج بیچارے اکثر و بیشتر ان کے دست نگر رہتے تھے۔ مالی اعتبار سے ہندو بنیوں اور یہودیوں کا جو کردار ہمیشہ رہا ہے وہ کسے معلوم نہیں؟ یہودی ایک تعلیم یافتہ قوم تھے' ان کے پاس آسمانی کتاب تھی یعنی تورات' ان کے ہاں شریعت تھی' قانون اور ضابطہ تھا' اُن کے ہاں فقہاء تھے' ان کے ہاں عدالتیں ہوتی تھیں جو فیصلے کرتی تھیں۔ اس اعتبار سے یہودی ایک متمدن قوم تھے۔ مگر اوس و خزرج کے ہاں ایسی کوئی چیز نہ تھی۔ لہٰذا ہر اعتبار سے یہودیوں کا پلڑا بھاری تھا۔

اب صورت یہ ہوئی کہ اوس و خزرج کے لوگ نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان لے آئے۔ البتہ وہ اس طور سے ایمان نہیں لائے تھے جس طرح مہاجرین ایمان لائے تھے' بلکہ وہ تو قبیلے کی سطح پر ایمان لائے تھے۔ ان میں جو سربرآوردہ افراد (Elders of the Clan) تھے انہوں نے فیصلہ کیا اور پورا قبیلہ ایمان لے آیا۔ تو آنحضور ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہ دونوں قبیلے ایمان لا چکے تھے۔ لیکن ان سب لوگوں کے ایمان کی کیفیت یکساں نہ تھی۔ بے شک ان میں وہ بھی تھے جو راسخ الایمان تھے' مگر ایسے بھی تھے جو صرف اپنے خاندان اور قبیلے کی سطح پر فیصلے کی وجہ سے مسلمان تو ہو گئے تھے مگر ان پر یہود کے بہت گہرے اثرات قائم رہے۔ درحقیقت یہی نقطۂ اتصال ہے کہ جہاں سے نفاق کا مرض شروع ہوا۔ ایسے ہی لوگوں کو یہودیوں نے اپنا آلۂ کار بنایا اور ان ہی کے ذریعے سے یہود کو مسلمانوں کی جماعت میں ریشہ دوانیاں اور سازشیں شروع کرنے کا موقع ملا۔ اس

لیے کہ اُن سے یہود کے سابقہ تعلقات تھے' حلیف ہونے کا ایک تعلق تھا' پھر یہود کا ایک رعب بھی تھا۔ یہ ساری چیزیں وہ تھیں جن کی بنا پر نبی اکرم ﷺ کو قدم قدم پر مشکلات پیش آئیں۔

آنحضور ﷺ کے اقدامات بغرضِ استحکام

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مدنی دَور کے بارے میں مَیں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مغربی مفکرین نے بھی آپ کی تعریف میں تمام superlative ڈگریاں استعمال کی ہیں۔ ایک مدبر اور سیاست دان' معاملہ فہم' دُور اندیش انسان' ایک نہایت ماہر سربراہِ مملکت' حکمران' سپہ سالار' نہایت اعلیٰ درجے کا قانون ساز اور منصف' غرض ہر اعتبار سے تعریف کے جتنے الفاظ ممکن ہیں انہوں نے استعمال کیے ہیں۔ منٹگمری واٹ آپ ﷺ کے لیے ''یکے از عظیم ترین فرزندانِ آدم'' (One of the greatest sons of Adam) کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور ڈاکٹر مائیکل ہارٹ تاریخ انسانی کے سو عظیم ترین انسانوں میں آپ ﷺ کو سرفہرست رکھنے پر مجبور ہے۔ اب اس تدبر کا تھوڑا سا نقشہ ذہن میں جماتے چلیں۔

مدینہ تشریف آوری کے بعد سب سے پہلے آپ ﷺ نے مدینہ میں اپنی پوزیشن کو مضبوط اور مستحکم (consolidate) کیا۔ ایک تو وہ لوگ تھے جو آپؐ کے ساتھ مکہ سے مہاجر ہو کر لُٹ پٹ کر آئے تھے اور یہاں مدینہ میں اُن کا نہ تو کوئی ذریعۂ معیشت تھا اور نہ ہی اپنا کوئی مکان تھا۔ یہاں کے لوگ جو ایمان لائے' وہ انصار کہلاتے تھے۔ یہاں آ کر سب سے پہلا کام جو آپؐ نے کیا وہ انصار اور مہاجرین کے مابین ''عقدِ مواخات'' تھا' جس کی نظیر تاریخ نسلِ انسانی میں نہیں ملتی۔ چنانچہ انصار نے سگے بھائیوں سے بڑھ کر مہاجرین سے سلوک کیا۔ یہاں تک کہ اگر کسی کے دو گھر تھے تو اُس نے ایک گھر اپنے انصاری بھائی کو دے دیا۔ اُس وقت کے جس معاشرے میں یہ ہو رہا ہے' اس کے پس منظر کو ذہن میں رکھئے۔ یہاں تک ہوا کہ ایک انصاری کی دو بیویاں تھیں' اُس نے اپنے مہاجر بھائی کو لا کر گھر میں کھڑا کر دیا (اُس وقت تک حجاب کا حکم نازل نہیں ہوا

تھا) اور کہا ان دونوں میں جو تمہیں پسند ہو میں اسے طلاق دے دیتا ہوں' تم اس سے شادی کر لو۔ اس درجہ کی اخوت ہو تو جماعت بنیانِ مرصوص بنتی ہے۔ اس کے بغیر قدم آگے اُٹھ ہی نہیں سکتا۔

دوسری طرف آپ ﷺ نے آتے ہی یہود سے معاہدے کر لیے اور انہیں گویا جکڑ لیا۔ یہود ان معاہدوں میں ایسے بندھے کہ بعد میں پیچ و تاب کھاتے رہے لیکن نبی اکرم ﷺ کی کھلم کھلا مخالفت نہ کر سکے۔ اس میں حکمت خداوندی بھی دیکھئے' اس کی طرف بہت کم لوگوں کی توجہ ہوئی ہے۔ مدینہ منورہ میں آنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے سولہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یہود کو کچھ احساس ہوا کہ یہ تو ہمارے متبعین میں سے ہیں' ہمارے camp followers ہیں' انہوں نے ہمارا قبلہ اختیار کیا ہے۔ گویا انہیں فوری طور پر یہ احساس نہ ہوا کہ نئی نبوت و رسالت ہماری سیادت و قیادت کی جڑیں کاٹ دے گی' بلکہ وہ کچھ مطمئن سے ہو گئے کہ ٹھیک ہے' نبوت تو نئی ہے' لیکن بہرحال وہ ہمارے قبلے کے پیروکار ہیں۔ یہ تو جب تحویل قبلہ کا حکم آیا تو ان کے کان کھڑے ہوئے کہ یہ معاملہ تو ایک نئی اُمت کے قیام کا ہے' ایک نئے مرکز کے گرد ایک نئی اُمت کی تشکیل ہو رہی ہے۔ لیکن نبی اکرم ﷺ کو سولہ سترہ مہینے مل گئے' جس میں آپؐ نے مدینہ منورہ میں اپنی پوزیشن کو پورے طور پر مستحکم کر لیا۔

راست اقدام کا مرحلہ

اس کے بعد اہم ترین واقعہ غزوۂ بدر ہے جو رمضان المبارک ۲ھ میں پیش آیا۔ اس کے بارے میں ہمارے ہاں کچھ مؤرخین نے خواہ مخواہ ایک معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تو جنگ کا آغاز نہیں کیا تھا' صرف دفاع کیا تھا' اور یہ کہ اسلام میں مدافعانہ جنگ کی تو اجازت ہے' جارحانہ جنگ کی اجازت نہیں ہے۔ حالانکہ جو صورت حال ہے اس کو آپ سمجھئے۔ اس پہلو سے تو کہا جا سکتا ہے کہ جنگ مسلمانوں پر ٹھونس دی گئی کہ اہل ایمان کو مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا۔ یہ ظلم جو مکہ کی سرزمین پر روا رکھا گیا یہ گویا قریش کی طرف سے جنگ کا آغاز تھا۔ چنانچہ سورۃ الحج کی آیات میں

اہلِ ایمان کو اذنِ قتال دیا گیا ہے:

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ﴿۳۹﴾ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ﴾ (آیات ۳۹، ۴۰)

''اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے' کیونکہ وہ مظلوم ہیں' اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا بلا کسی جرم کے' سوائے اس کے کہ انہوں نے یہ کہا کہ ہمارا ربّ اللہ ہے!''

یہ آیات اثنائے سفرِ ہجرت میں نازل ہوئیں۔ اس اعتبار سے تو یقیناً آغاز قریش کی طرف سے ہو چکا تھا۔ لیکن متعین طور پر ہجرت کے بعد جو اقدام ہوا ہے وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہوا ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ اگر بالفرض قریش چڑھائی کر کے نہ آتے اور وہ صورت حال کو علیٰ حالہٖ (status quo) تسلیم کر لیتے کہ ٹھیک ہے' ہمارے سر سے بلا ٹلی' اب یہ مدینہ میں بیٹھے اپنی دعوت و تبلیغ کریں' ہم یہاں بیٹھے ہیں' تو کیا نبی اکرم ﷺ مکہ مکرمہ کو مشرکین کے تسلط سے نکالنے کے لیے اور اللہ کے دین کو غالب و سربلند کرنے کے فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لیے اقدام نہ فرماتے؟ تو یہ بات سمجھ لیجیے کہ درحقیقت بعثتِ محمدیؐ کا جو امتیازی مقصد ہے ﴿لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ اس کے لیے اب اقدام خود نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ہوا۔ چنانچہ غزوۂ بدر سے قبل رسول اللہ ﷺ نے آٹھ فوجی مہمات روانہ فرمائیں' جن میں سے چار میں آپؐ بنفسِ نفیس شریک ہوئے۔ ان مہمات کا مقصد مکہ کی معاشی ناکہ بندی تھا۔ قریش کے تجارتی قافلوں کا راستہ مدینہ منورہ اور بحیرۂ احمر کے ساحل کے درمیان سے ہو کر گزرتا تھا۔ یہ یمن اور شام کے مابین تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کا واحد راستہ تھا۔ اس کی حیثیت معاشی اعتبار سے قریش کی رگِ جان (life line) کی تھی۔ آپ ﷺ نے ان کی اس رگِ جان پر ہاتھ ڈالا اور ان کے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کو مخدوش بنا دیا۔

اس ضمن میں ہجرت کے فوراً بعد کا ایک واقعہ بہت اہم ہے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اوس کے سردار تھے۔ آپ مدینہ سے مکہ گئے۔ وہاں آپ خانہ کعبہ کا طواف کر

رہے تھے کہ ابوجہل نے دیکھ لیا اور کہا: تم نے ہمارے مفروروں کو پناہ دی ہے' اب ہم تمہیں یہاں نہیں آنے دیں گے اور طواف نہیں کرنے دیں گے۔ اس پر سعد بن معاذؓ نے جواب دیا کہ ذرا سوچ لو' ہم تمہارے قافلے نہیں گزرنے دیں گے۔ اس لیے کہ قریش کی ساری سیادت' ساری چودھراہٹ اور ساری خوشحالی کا دارومدار اس بات پر تھا کہ اہل عرب ان کے قافلوں سے تعرض نہیں کرتے تھے کہ یہ کعبہ کے متولی ہیں۔ چنانچہ حضرت سعد بن معاذؓ نے واضح کر دیا کہ ہم پر کعبہ کا راستہ بند کیا تو پھر وہ مراعات اور منفعتیں جو تمہیں حاصل ہیں' حاصل نہیں رہیں گی۔ بالکل وہی بات ہوئی کہ نبی اکرم ﷺ نے چھاپہ مار دستے بھیجے اور ان کے تجارتی قافلوں کو چاروں طرف سے مخدوش بنا دیا۔

مسلح تصادم کا آغاز

اس سلسلے کا اہم ترین واقعہ نخلہ کا ہے جس نے مکہ میں گویا آگ لگا دی۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحش ؓ کو چند افراد کے دستے کا کمانڈر بنا کر ہدایت فرمائی کہ مکہ اور طائف کے درمیان جا کر وادیٔ نخلہ میں قیام کرو اور قریش کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھو۔ وادیٔ نخلہ میں قیام کے دوران وہاں قریش کے ایک مختصر سے قافلے کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی اور مسلمانوں کے ہاتھوں ایک مشرک عمرو بن عبداللہ الحضرمی مارا گیا۔ اب اتفاقاً کہہ لیں یا مشیتِ الٰہی کہہ لیں' ہجرت کے بعد پہلا خون مسلمانوں کے ہاتھوں ہوا۔ مکہ میں جب یہ خبر پہنچی تو وہاں کہرام مچ گیا اور چیخ و پکار شروع ہو گئی کہ خون کا بدلہ خون!

دوسری طرف ابوسفیان کی سرکردگی میں جانے والا تجارتی قافلہ مال و اسباب سے لدا پھندا اب شام سے واپس آ رہا تھا۔ چونکہ ابوسفیان کو کچھ اندیشہ ہو گیا تھا لہٰذا اُس نے مکہ مکرمہ کی طرف قاصد دوڑا دیے کہ ہو سکتا ہے ہم پر مسلمان حملہ کر دیں' لہٰذا ہماری حفاظت کے لیے ایک مسلح دستہ بھجوایا جائے۔ ادھر ابوجہل کا مزاج Hawks کا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح جنگ ہو' ہم فوج کشی کریں اور اسلام کے اس چراغ کو گل کر دیں۔ لہٰذا اُس نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ایک واویلا مچا دیا کہ مکہ والو! تمہاری ساری دولت خطرے میں ہے' تمہارے تجارتی قافلے کو محمد (ﷺ) لوٹنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اُدھر

سے ایک ہزار کا لشکر کیل کانٹے سے لیس ہو کر نکل کھڑا ہوا۔ اِدھر مشیت ربانی کا فیصلہ کچھ اور ہی تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو مدینہ سے نکلنے کا حکم ہوا۔ مدینہ منورہ میں آنحضور ﷺ نے اپنا ارادہ واضح نہیں فرمایا' نفیرِ عام بھی نہیں تھی کہ ہر مسلمان ضرور چلے۔ آپ ایک جمعیت لے کر نکلے۔ ابھی آپ نے کچھ ظاہر نہیں فرمایا کہ کہاں جا رہے ہیں۔

غزوۂ بدر سے قبل مشاورت

مدینہ سے ذرا باہر نکل کر آپ نے مجلسِ مشاورت منعقد کی اور فرمایا: مسلمانو! دو جماعتیں ہیں' ایک قافلہ شمال سے آ رہا ہے' اُس کے ساتھ بہت سا مالِ تجارت ہے' صرف پچاس محافظوں کا ایک دستہ اُس کے ساتھ ہے۔ جبکہ ایک اور لشکر جنوب سے آ رہا ہے جو کیل کانٹے سے لیس ہے' اور اللہ تعالیٰ نے ان دو میں سے ایک پر فتح کا وعدہ فرمایا ہے۔ مسلمانو! بتاؤ' کدھر کا قصد کریں؟ سورۃ الانفال میں اس پوری مشاورت کا ذکر آیا ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ: ﴿وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ﴾ (الانفال:۷) ''اور (اے مسلمانو!) تم تو چاہتے تھے کہ تمہیں وہ جماعت ملے جس میں تمہیں کانٹا نہ چبھے''۔ بہرحال بر بنائے طبع بشری یہ تو کوئی بھی پسند نہیں کرتا کہ لقمۂ تر کو چھوڑ کر لوہے کے چنے کو چبانے کی کوشش کرے' سوائے اُن لوگوں کے جو طے کر چکے ہوں کہ تن من دھن اللہ کی راہ میں لگا دیں گے۔ چنانچہ اس جماعت میں بھی کچھ لوگ وہ تھے جن کی رائے یہ ہوئی کہ قافلے کی طرف چلنا چاہیے۔

نبی اکرم ﷺ نے یہ مشورہ دراصل ساتھیوں کے عزم و حوصلہ (morale) کو دیکھنے کے لیے کیا تھا کہ اندازہ ہو جائے کہ ان کی سوچ کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ مشورہ طلب کر رہے ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مشورہ دے رہے ہیں۔ ایک اپنی بات کہہ رہا ہے تو دوسرا اپنی۔ ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تقریر کرتے ہیں کہ حضور ﷺ! ہمیں لشکر کی طرف چلنا چاہیے۔ آپ متوجہ نہیں ہو رہے۔ مہاجرین میں سے کچھ اور حضرات نے تقریریں کیں' حضور ﷺ نے اہمیت نہ دی۔ آخر میں حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے بڑی پیاری تقریر کی کہ حضورؐ! ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وہ ساتھی نہ سمجھئے جنہوں نے جنگ کا مرحلہ

آنے پر کہہ دیا تھا کہ: ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ (المائدۃ) یعنی اے موسیٰؑ! ''جاؤ تم اور تمہارا ربّ جا کر جنگ کرو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں''۔ ہم وہ نہیں ہیں، لیکن آنحضور ﷺ ادھر بھی التفات نہیں فرما رہے۔ اب انصار کو خیال ہوا کہ معاملہ اصل میں ہم سے متعلق ہے اور رسول اللہ ﷺ ہماری رائے کا انتظار فرما رہے ہیں۔ اس لیے کہ بیعتِ عقبہ ثانیہ جس کے نتیجے میں مدینہ منورہ دار الہجرت بنا اور آنحضور ﷺ یہاں تشریف لائے، اس میں یہ چیز شامل نہیں تھی کہ انصار مدینہ سے باہر نکل کر بھی آپ ﷺ کے ساتھ ہو کر جنگ لڑیں گے۔ اس کی رو سے تو اگر مدینہ پر کوئی حملہ کرے اور وہاں رسول اللہ ﷺ کو کوئی گزند پہنچانا چاہے، تب انصار پابند تھے کہ وہ آپؐ کی حفاظت کریں گے۔ اس سے زیادہ کا معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ خزرج کے رئیسِ اعظم حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے یہ بات بھانپ لی اور کھڑے ہو گئے۔ خزرج بہت بڑا قبیلہ تھا، اس کی تعداد اوس کے مقابلے میں کم سے کم تین گنا تھی۔ چنانچہ رئیس انصار اصل میں یہی تھے۔ ان کی تقریر بڑے معرکے کی تقریر ہے۔ انہوں نے کہا حضورؐ! اس بیعتِ عقبہ والے معاملے کو اب آپ بھول جائیے، اِنَّا آمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ۔ ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں اور آپ کی تصدیق کر چکے ہیں۔ اب آپؐ کا جو ارادہ ہو، جو قصد ہو، بسم اللہ کیجیے! اگر آپ ہمیں سمندر کے کنارے لے جا کر کھڑا کر دیں گے اور اس میں چھلانگ لگانے کے لیے کہیں گے تو ہم بے دریغ اس میں چھلانگ لگا دیں گے۔ آپؐ کا جدھر چلنے کا ارادہ ہے چلیے۔ یعنی کسی تردّد کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دیجیے۔ اب یہاں معاملہ اللہ کے رسولؐ اور اس کی اُمت کا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمایا اور قافلہ بدر کو روانہ ہو گیا۔

غزوۂ بدر: یوم الفرقان

دیکھیے عجیب بات ہے کہ مشیت ایزدی بعض اوقات بندوں کی مشیت کے ساتھ آ کر منطبق ہو جاتی ہے۔ بدر میں بھی یہی معاملہ ہوا کہ ایک طرف دشمنِ خدا چاہتا تھا کہ جنگ ضرور ہو، اسے اپنی طاقت کا غرہ تھا اور وہ ایک ہزار کا کیل کانٹے سے مسلح لشکر لے کر آیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی فتح یقینی ہے۔ لہٰذا اُس نے کہا تھا کہ یہ دن ''یومِ فرقان'' ہو گا۔

قرآن مجید نے بھی سورۃ الانفال میں غزوۂ بدر کو ''یوم الفرقان'' کا نام دیا ہے۔ یہ اصل میں اسی کا دیا ہوا نام ہے، جس کو قرآن نے اختیار کرلیا۔ ابوجہل کا کہنا تھا کہ آج طے ہوجائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر! اور یہ اس لیے کہہ رہا تھا کہ اس کو اپنی فتح کا یقین تھا۔

دوسری طرف اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہماری مشیت بھی یہی تھی کہ ٹکراؤ ہو، ہم بھی یہ چاہتے تھے کہ حق اور باطل کا فیصلہ ہوجائے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝٨﴾ (الانفال) ''تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو''۔ اور ﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۭ﴾ (الانفال:٤٢) ''تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ دلیلِ روشن کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیلِ روشن کے ساتھ زندہ رہے''۔ اب خدائی مشیت اور ابوجہل کی مشیت نتیجے کے اعتبار سے ایک نقطے پر مرکوز ہوگئی۔

یہ بھی جان لیجیے کہ قریش میں مزاج کے اعتبار سے دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک جنگجو اور مشتعل مزاج (Hawks) اور دوسرے بُردبار طبیعت کے حامل امن پسند لوگ (Doves)۔ میں نے گزشتہ نشست میں ایک شریف النفس شخص مُطعم بن عدی کا ذکر کیا تھا جو طائف سے واپسی پر نبی اکرم ﷺ کو اپنی امان میں مکہ لے کر گیا تھا۔ اسی طرح عُتبہ بن ربیعہ ایمان اگرچہ نہیں لایا، کفر ہی پر مرا، لیکن اس میں شرافت تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تصادم ہو۔ حکیم بن حزامؓ جو بعد میں ایمان بھی لے آئے، وہ بھی چاہتے تھے کہ تصادم نہ ہو۔ یہ دونوں آپس کی خونریزی سے بچنا چاہتے تھے، لہٰذا انہوں نے تحریک شروع کی کہ جس مقصد کے لیے ہم آئے تھے وہ تو پورا ہوگیا، ہمارا قافلہ تو محفوظ نکل گیا، اب خون ریزی کی کیا ضرورت ہے! عتبہ بن ربیعہ بڑا دُور اندیش اور دانش مند شخص تھا۔ اس نے قریش سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اب تم محمد (ﷺ) کے خلاف کوئی اقدام مت کرو، بلکہ انہیں عرب کے حوالے کردو، وہ خود نبٹ لیں گے۔ اگر محمدؐ جیت گئے تو آخر وہ ہمارے ہی تو ہیں، ان کی جیت ہماری ہی جیت ہوگی۔ ایک قرشی اگر پورے عرب پر غالب آجاتا ہے تو یہ قریش ہی کا غلبہ ہے، اور اگر عرب اس پر غالب آگئے تو جو تم چاہتے ہو وہ ہوجائے گا اور

تمہیں خواہ مخواہ اپنے بھائیوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین نہیں کرنے پڑیں گے۔

یہ بات اتنی وزنی تھی کہ پورے لشکر میں پھیل گئی کہ ٹھیک ہے، جنگ نہیں ہونی چاہیے۔ دوسری طرف Hawks کا سرخیل ابوجہل ڈٹا ہوا تھا کہ جنگ ہوگی۔ وہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں کے خلاف فوری اقدام کیا جائے۔ اُس نے واقعۂ نخلہ کے مقتول عمرو بن عبداللہ الحضرمی کے بھائی کو بلایا اور اُسے انتقام لینے کے مطالبے پر اُکسایا۔ چنانچہ اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، چیخنا اور پکارنا شروع کر دیا کہ یہ غداری ہو رہی ہے، میرے بھائی کے خون کا بدلہ لیا جانا چاہیے۔ ابوجہل نے عتبہ بن ربیعہ کو بھی عرب حمیت کے حوالے سے طعنہ دیا کہ تم بزدلی دکھا رہے ہو۔ اس نے کہا کل میدانِ جنگ میں پتا چلے گا کہ بزدل کون ہے! گویا عربی حمیت جوش میں آ گئی اور اس طرح جنگ ہو کر رہی۔

رسول اللہ ﷺ کی دُعا

اب ذرا جنگ سے پہلی رات کا تصور کیجیے۔ اُدھر ایک ہزار کیل کانٹے سے لیس لشکر اور اِدھر صرف تین سو تیرہ آدمی، ستر اونٹ اور دو گھوڑے۔ تلواریں بھی سب کے پاس نہیں۔ وہ تو مدینہ سے جنگ کے لیے نکلے ہی نہ تھے، نہ انہیں پہلے سے خبردار کیا گیا تھا۔ پھر قوم وہ ہے جس کو عرب میں لڑاکا قوم سمجھا ہی نہیں جاتا تھا، یعنی انصار —— اور صبح ٹکراؤ ہونے والا ہے۔ دونوں فوجوں کے عین بیچوں بیچ گھاس پھونس کی ایک جھونپڑی بنائی گئی ہے جس کے اندر اللہ کے رسول ﷺ سربسجود ہیں۔ اُس رات آپ ﷺ نے بڑا طویل سجدہ کیا، جس میں بڑی طویل دعا کی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ننگی تلوار لیے ہوئے پہرے پر کھڑے ہیں۔ اُس رات کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک قول ملتا ہے کہ ہم میں سب سے زیادہ شجاع ابوبکرؓ تھے۔ اس لیے کہ اُس شب کو جو سب سے زیادہ خطرناک شب تھی، محمد رسول اللہ ﷺ کے پہرے دار ابوبکرؓ تھے۔ اُس وقت آپ ﷺ نے جو دعا مانگی ہے اگرچہ اس میں بہت ہی عاجزی اور تضرع تھا، تاہم نیاز سے بڑھ کر اُس میں ناز کا انداز تھا۔ اس دعا میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ اے اللہ! اگر یہ لوگ کل یہاں ہلاک ہو گئے تو پھر قیامت تک تجھے پوجنے والا کوئی نہ ہوگا!..... یہ بات آپ ﷺ نے اس لیے

فرمائی کہ آپ آخری نبی اور رسول ہیں۔ آپ ﷺ نے بارگاہِ ربّ العزت میں مزید عرض کیا کہ پروردگار! یہ میری پندرہ برس کی کمائی ہے جو مَیں نے میدان میں لا کر ڈال دی ہے! اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور! بس کیجیے' بس کیجیے' یقیناً اللہ آپ کی مدد فرمائے گا۔ پھر آپ ﷺ نے پیشانی اٹھائی اور زبانِ مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے: ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿٤٥﴾﴾ (القمر) گویا اللہ کی طرف سے خوشخبری تھی کہ ''عنقریب اس جمعیت کو شکست ہو کر رہے گی اور یہ پیٹھ دکھا کر بھاگیں گے''۔ چنانچہ آپ ﷺ نے صبح کے وقت نشان دہی فرما دی کہ فلاں کافر فلاں جگہ قتل ہوگا۔

بدر کا معرکہ کارزار

غزوۂ بدر حقیقی معنی میں یوم الفرقان ثابت ہوا اور اس میں قریش کے ستر سربرآوردہ لوگ مارے گئے۔ ابوجہل دو انصاری نوجوانوں حضرت معاذ اور معوذ رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں قتل ہوا۔ یہ دونوں teenagers تھے۔ عین معرکے کے دوران یہ دونوں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے آ کر پوچھتے ہیں چچا جان! ہم نے سنا ہے کہ ابوجہل نامی کوئی شخص مکہ کا باشندہ ہے جس نے ہمارے نبی ﷺ کو بہت زیادہ ایذائیں پہنچائی ہیں' ہمیں بتا دیجیے وہ کہاں ہے۔ انہوں نے اشارہ کیا وہ ہے ابوجہل۔ اُس کی حیثیت سپہ سالار کی تھی اور وہ گھوڑے پر سوار کسی خاص مقام پر کھڑا تھا۔ یہ دونوں تیر کی طرح وہاں پہنچے۔ ظاہر بات ہے اس کا کوئی باڈی گارڈ دستہ بھی ہوگا' مگر کسی کو سمجھ ہی نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ دونو جوان دوڑتے ہوئے گئے اور اُس پر اچانک حملہ کر کے اسے زمین پر گرا دیا۔ جب اس کی گردن کاٹنے لگے تو وہ کہنے لگا کہ گردن ذرا نیچے سے کاٹنا تاکہ جب میرا سر نیزے پر رکھو تو اونچا نظر آئے' معلوم ہو کہ کسی سردار کا سر ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ اُس کی لاش پر آئے اور آپؐ نے اس کی گردن پر پاؤں رکھا تو فرمایا: ((هٰذَا فِرْعَوْنُ أُمَّتِيْ))(۱) ''یہ میری اُمت کا فرعون ہے''۔ عتبہ بن ربیعہ نے اپنی وہ بات صحیح ثابت کر کے دکھا دی جو اُس نے ابوجہل کے جواب میں کہی تھی۔ چنانچہ پہلا شخص جو میدانِ جنگ میں آیا' وہی

(۱) مسند احمد ۳۱۷/۵۔ مجمع الزوائد للهيثمي ۸۱/۶۔ راوی: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

تھا اور وہ اپنے بھائی شیبہ اور اپنے بیٹے ولید کو ساتھ لے کر نکلا تھا۔ وہ خود حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں واصل جہنم ہوا۔

یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ شروع میں جب کفار کی طرف سے تین افراد نکلے اور ادھر سے تین انصاری ان کے مقابلے کے لیے نکلے تو عتبہ نے چیخ کر کہا اے محمد! ہماری توہین نہ کرو' یہ ہمارے مقابل کے لوگ نہیں ہیں' ہم ان کاشت کاروں سے لڑنے کے لیے نہیں آئے' ہمارے مقابلے کے لیے انہیں بھیجو جو ہمارے مدمقابل ہیں۔ تب حضرت حمزہ' حضرت عبیدہ بن حارث اور حضرت علی رضی اللہ عنہم مقابلے کے لیے نکلے۔

غزوۂ بدر رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد میں مسلح تصادم (Armed conflict) کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور فیصلہ کن معرکہ بھی یہی تھا جس نے تاریخ کو بدل دیا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اللہ کس کے ساتھ ہے۔ اس لیے کہ دو فریقوں میں باہم کوئی نسبت ہی نہیں تھی۔ اتنا بڑا لشکر کیل کانٹے سے مسلح ہو اور غرقِ آہن ہو کر آئے اور پٹ جائے اس چھوٹے سے دستے کے ہاتھوں جن کی اکثریت کاشت کار تھی اور وہ جنگجو لوگ بھی نہ تھے۔ ان کے پاس کوئی ساز و سامان نہیں تھا' اسلحہ نہیں تھا۔ تو معلوم ہو گیا کہ حق کس کے ساتھ ہے۔ درحقیقت یہی بات ہے جس کی وجہ سے اس دن کو ''یوم الفرقان'' کہا گیا۔

غزوۂ بدر کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورے عرب میں اہل ایمان کی دھاک بیٹھ گئی اور لوگ تیزی کے ساتھ اسلام کی طرف آنے لگے۔ چنانچہ اگلے سال غزوۂ اُحد میں اوس و خزرج میں سے اگر کچھ لوگ ابھی مذبذب تھے تو اُن کے دل بھی ٹھک گئے کہ بات یہی ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح جو نفری آئی اللہ تعالیٰ نے اس کی چھانٹی کی۔ غزوۂ اُحد کی حکمت کو ذہن میں رکھیے کہ یہ درحقیقت تطہیر اور چھانٹی (purge) کے لیے تھا کہ یہ کچے پکے لوگوں کی بھیڑ جو محمد ﷺ کے گرد جمع ہو گئی ہے' اس میں سے ناپختہ لوگوں کو الگ کر دیا جائے۔ ابھی تو عالمی سطح پر انقلاب کے لیے بڑی محنت شاقہ کی ضرورت ہے۔ اس فتح کے نتیجے میں اگر ناپختہ لوگ جمع ہو گئے تو جماعت بحیثیت مجموعی کمزور ہو جائے گی۔

غزوۂ اُحد

غزوۂ بدر کے ایک ہی سال بعد شوال ۳ ہجری میں مشرکینِ مکّہ کا جوابی حملہ ابوسفیان کی سرکردگی میں ہوا جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔ تین ہزار کا لشکر پورے اہتمام کے ساتھ حملہ آور ہوا اور ان کی ہمتیں دیکھئے کہ عین مدینہ منورہ تک پہنچ گئے۔ دامنِ اُحد جہاں یہ معرکہ ہوا' مدینہ سے کُل چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس موقع پر مشاورت ہوئی کہ کیا کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کی اپنی رائے یہی تھی کہ شہر کے اندر رہ کر مقابلہ کیا جائے۔ یہاں پھر دیکھئے' کون کون سی دو رائیں یکجا ہو رہی تھیں! تاریخ کا مطالعہ اس اعتبار سے کیا جائے تو بڑا دلچسپ ہے۔ غزوۂ بدر میں مشیتِ خداوندی اور خواہشِ ابوجہل یکجا ہو گئی اور یہاں محمد رسول اللہ ﷺ کی رائے اور رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کی رائے ایک ہو گئی۔ عبداللہ بن اُبی خزرج کا بہت بڑا سردار تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری سے قبل اس بات کا فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کو مدینہ کا بادشاہ مان لیا جائے گا۔ اس کے لیے تاج تیار ہو چکا تھا' صرف تاجپوشی کی رسم باقی تھی کہ محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور اس کی بادشاہی اور سیادت و قیادت کا چراغ گُل ہو گیا۔ لہٰذا اس کے دل میں جو عداوت اوّل روز سے محمد رسول اللہ ﷺ سے تھی' اس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ قبائلی اثرات کے تحت وہ بھی ایمان تو لے آیا لیکن وہ منافقِ اعظم ثابت ہوا۔ اس کی بھی رائے یہ تھی کہ ہماری اتنی طاقت نہیں ہے کہ کھلے میدان میں جا کر تین ہزار کے لشکر کا مقابلہ کر سکیں' لہٰذا مدینہ میں محصور ہو کر جنگ کی جائے۔ اس نے کہا تھا کہ یارسول اللہ! مدینہ کی تاریخ یہی ہے کہ جب بھی ہم نے باہر نکل کر مقابلہ کیا تو اکثر ہمیں زک اٹھانی پڑی' اور جب ہم نے اندر محصور ہو کر مقابلہ کیا تو دشمن کے فوجیوں سے ہمارے نوجوان لڑتے تھے اور اوپر سے ہماری عورتیں اور بچے ان پر سنگ باری کرتے تھے' اور مخالف تنگ جگہوں پر بٹ کر آتے تھے' لہٰذا ہم جیت جاتے تھے۔

آنحضور ﷺ کی اپنی رائے بھی یہی تھی' لیکن ایک تو اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض حضرات کھلے میدان میں جنگ کرنے کے حامی تھے' دوسرے یہ کہ نوجوانوں کی

طرف سے بڑے جوش وخروش کا مظاہرہ ہو رہا تھا' خاص طور پر وہ نوجوان جو غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے یا فتحِ بدر کے بعد ایمان لائے تھے' ان کا جوش وخروش دیدنی تھا کہ کھلے میدان میں جا کر جنگ کرنی چاہیے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی رائے پر اصرار نہیں فرمایا اور ان حضرات کی بات مان لی۔ فیصلہ ہو گیا کہ کھلے میدان میں لڑیں گے۔ اس کے بعد آپ ﷺ اپنے حجرۂ مبارک میں تشریف لے گئے اور برآمد ہوئے تو آپؐ نے زرہ پہنی ہوئی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی جس پر لوگوں کا ماتھا ٹھنکا اور انہوں نے چاہا کہ اپنی رائے واپس لے لیں' مگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی نبی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ہتھیار پہن کر اتار دے۔ سورۂ آل عمران میں اسی کا حکم ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ (آیت ۱۵۹) ''اور آپ ان سے معاملات میں مشورہ لیجیے' پس جب آپ فیصلہ کر لیں تو پھر اللہ پر توکل کیجیے''۔ یعنی جب فیصلہ کر لیں تو پھر ڈٹ جائیں اور اللہ پر بھروسہ کریں۔ یہ بار بار کے فیصلے بدلنے اچھے نہیں۔

دامنِ اُحد میں جنگ کا آغاز ہوا اور پہلے ہی ہلے میں اللہ کی مدد و نصرت آئی اور بدر کا نقشہ سامنے آ گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے پچاس تیراندازوں کا ایک دستہ ایک انتہائی حساس درے پر تعینات فرمایا تھا۔ جب مشرکین کے قدم اکھڑ گئے تو مسلمانوں کی ایک جماعت نے ان کا پیچھا کیا اور ایک جماعت مالِ غنیمت سمیٹنے میں لگ گئی۔ اس صورت حال میں درّے پر تعینات تیراندازوں میں سے اکثر نے یہ کہا کہ اب تو فتح ہو گئی ہے' اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔ ان کے کمانڈر نے انہیں اس سے روکا' لیکن وہ ان کی حکم عدولی کرتے ہوئے نیچے اتر آئے اور مالِ غنیمت سمیٹنے لگے۔ قریش کی فوج کے ساتھ دو سو گھڑ سواروں کا دستہ تھا جس کے سپہ سالار خالد بن ولید تھے۔ ان کی عقابی نگاہ نے جب درّہ خالی دیکھا تو گھڑ سوار دستے کے ساتھ اُحد کا چکر کاٹ کر اُس درّے کے راستے مسلمانوں کے عقب سے حملہ آور ہو گئے۔ درّے پر صرف پندرہ تیرانداز باقی رہ گئے تھے جو شہید ہو گئے۔ خالد بن ولید کے عقبی حملہ نے مسلمانوں کو سراسیمہ کر دیا۔ دوسری طرف

بھاگنے والے کفار نے صورت حال میں تبدیلی دیکھی تو انہوں نے پلٹ کر زوردار حملہ کر دیا۔ اب مسلمان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان آ گئے اور فتح شکست میں بدل گئی۔

سورۂ آلِ عمران میں غزوۂ اُحد پر بڑی تفصیل سے تبصرہ کیا گیا ہے کہ مسلمانو! تمہیں جو زک اٹھانی پڑی وہ اس لیے اٹھانی پڑی کہ اللہ یہ چاہتا تھا کہ تم اپنی کمزوریوں سے واقف ہو جاؤ۔ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ﴾ (آیت ۱۵۲)

''(مسلمانو! تم اپنی شکست کا اللہ کو کوئی الزام نہیں دے سکتے) اللہ نے تو (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ پورا کر دکھایا' جبکہ تم اس کے حکم سے اپنے دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔ مگر جب تم ڈھیلے پڑے' تم نے معاملہ میں اختلاف کیا' اور تم (اپنے امیر کی) حکم عدولی کر بیٹھے' بعد اس کے کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھائی (یعنی فتح) جو تمہیں محبوب تھی (تو اللہ نے تمہیں پسپا کر دیا)۔ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔''

عبداللہ بن اُبی جنگ سے پہلے ہی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر علیحدہ ہو گیا تھا۔ معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کی جماعت میں اب منافقین کا عنصر شامل ہو چکا ہے۔ نبی اکرم ﷺ ایک ہزار کو لے کر نکلے تھے' تین سو چلے گئے تو تین ہزار کے مقابلے میں صرف سات سو رہ گئے۔ ابتدائی فتح کے بعد شکست ہوئی اور ستر مسلمان دامنِ اُحد میں شہید ہوئے۔ یہ بالکل وہی تعداد ہے جو میدانِ بدر میں مشرکین کے مقتولین کی تھی۔ ارشاد ہوا: ﴿وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ﴾ (آل عمران: ۱۴۰) ''اور ہم ان دنوں کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں!''

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے' حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے' وہ مصعب بن عمیرؓ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کہ ان کے کپڑوں کا ایک ایک جوڑا دو دو سو درہم کا ہوتا

تھا اور شام سے ڈھل کر آیا کرتا تھا۔ معطّر لباس پہنے ہوئے مکّہ کی گلیوں میں نکلا کرتے تھے تو اشارے ہوتے تھے کہ دیکھو وہ کون جا رہا ہے! حضرت محمد ﷺ پر ایمان لائے اور مُقری بنا کر مدینہ منورہ بھیج دیے گئے۔ قبولِ اسلام کے بعد حال یہ ہو گیا کہ بدن پر سوائے پیوند لگے ہوئے کمبل کے اور کچھ نہیں۔ واقعہ آتا ہے کہ آنحضور ﷺ مسجد نبویؐ میں تشریف فرما تھے کہ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کا سامنے سے گزر ہوا' ان کے بدن پر ایک پھٹی ہوئی کملی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ یہ نوجوان کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا! جب دامن اُحد میں انہیں شہادت کا مرتبہ ملا تو تدفین کے وقت یہ مسئلہ سامنے آیا کہ شہید کا تو کوئی کفن نہیں ہوتا سوائے ان کپڑوں کے جو اُس وقت اس کے بدن پر ہوں' اور ان کے بدن پر ایک ہی چادر تھی جو اتنی چھوٹی تھی کہ پورے جسم کو ڈھانپ نہیں پا رہی تھی۔ اگر سر کو ڈھانپتے تھے تو پاؤں کھل جاتے تھے اور پاؤں کو ڈھانپتے تھے تو سر کھل جاتا تھا۔ معاملہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا کہ کیا کیا جائے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ان کے سر کو چادر سے ڈھانپ دو اور پاؤں پر گھاس ڈال دو۔ یہ آخری لباس ہے اُس دو دو سو درہم کا جوڑا پہننے والے نوجوان کا!

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ اُن کی لاش کا مُثلہ ہوا' کلیجہ چبایا گیا۔ اُس وقت جو قلبِ محمدؐ پر بیت رہی ہو گی آپ ذرا اُس کا تصور کیجیے۔ آخر آپ ﷺ کے سینے میں کوئی پتھر کا ٹکڑا تو نہیں تھا' بڑا حساس قلب تھا۔ جو کچھ بیت رہی تھی اس کا اظہار ہوا۔ آپؐ مدینہ تشریف لائے تو سارا شہر ماتم کدہ بنا ہوا تھا' ہر گھر سے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ اُس وقت آپ ﷺ کی زبان پر یہ الفاظ آئے: ((لٰکِنَّ حَمْزَةَ لَا بَوَاکِیَ لَهٗ!)) (۱) (حمزہ کے لیے تو کوئی رونے والی بھی نہیں!)۔ انصار اپنے گھروں میں گئے اور اپنی خواتین کو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بہن اور آپ ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا۔

رسول اللہ ﷺ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے' خود کی کڑیاں تلوار کے شدید وار کی وجہ سے پیشانی کی ہڈی میں گھس گئیں۔ آپؐ پر غشی طاری ہوئی۔ یہ بھی مشہور ہو گیا کہ آپ ﷺ

(۱) سنن ابن ماجه' کتاب الجنائز' باب ما جاء فی البکاء علی المیت۔

کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان سارے واقعات کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے۔

غزوۂ احزاب

غزوۂ اُحد میں ہزیمت کا نتیجہ یہ نکلا کہ بدر کی فتح کے بعد جو فضا بنی تھی' اب اُس کے بالکل برعکس ہو گئی۔ وہ دھاک جو بیٹھی تھی' ختم ہو گئی اور مسلمانوں کی ہوا اکھڑ گئی۔ لہٰذا اب جو وقت آیا وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی شدید ترین تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے بھی۔ چاروں طرف سے قبائل کے حوصلے بلند ہو گئے۔ صورت حال یہ ہو گئی کہ آج اِدھر سے آ کر کوئی چھاپہ مار گیا تو کل اُدھر سے آ کر کوئی حملہ کر گیا' کوئی اونٹ لے کر نکل گیا اور کوئی آ کر نخلستانوں میں آگ لگا گیا۔ ادھر یہودی بھی شیر ہو گئے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کے قتل کی سازشیں ہو رہی ہیں۔ بظاہر دعوت میں بلایا جا رہا ہے' اوپر سے پتھر برسانے کی سکیم بن رہی ہے۔ طرح طرح کے شوشے چھوڑے جا رہے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی گئی ہے' جس میں غیر تو غیر کچھ اپنے بھی ملوث ہو گئے ہیں۔ یہ دو سال محمد رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ پر بڑے کٹھن گزرے ہیں۔ اس کٹھنائی اور سختی کا نقطۂ عروج غزوۂ اَحزاب ہے۔

یہ بات ابھی تک عقدۂ لاینحل ہے کہ غزوۂ اُحد میں تقریباً فیصلہ کن فتح حاصل کرنے کے بعد مشرکین واپس کیوں چلے گئے! بہرحال انہیں جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی معلوم تھا کہ یہ لوگ کچھ دور جا کر ہی سوچیں گے کہ ہم نے یہ کیا حماقت کی' اور پھر پلٹنے کا خیال کریں گے۔ لہٰذا اگرچہ مسلمان زخموں سے چور چور تھے لیکن آپؐ نے اُن سے فرمایا کہ کفار کا پیچھا کرو' ورنہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تو وہ پھر لوٹیں گے۔ بہرحال جس طرح طائف کا دن رسول اللہ ﷺ کے لیے شخصی اور انفرادی سطح پر اہم ترین موڑ تھا اسی طرح غزوۂ خندق (غزوۂ اَحزاب) مسلمانوں کی جماعت کے لیے turning point تھا۔

غزوۂ اَحزاب میں مسلمانوں کے خلاف تین قوتیں مجتمع تھیں: (۱) قریش کی بھرپور طاقت۔ (۲) یہود کی مکمل طاقت جو مدینہ سے جلاوطن کر دیے گئے تھے۔ اُنہیں اُن کی

بدعہدی کی وجہ سے مدینہ سے نکال دیا گیا تھا اور اب یہ خیبر میں آباد تھے۔ (۳) ادھر سے نجد کی طرف کے قبائل یعنی اہلِ عرب کی پوری طاقت مجتمع ہوگئی تھی اور بارہ ہزار کے لشکر جرار نے مدینہ کو آ کر گھیر لیا تھا۔ اُس وقت کے اعتبار سے یہ بہت بڑا لشکر تھا اور عرب میں اس سے پہلے کبھی اتنا بڑا لشکر جمع نہیں ہوا تھا۔ دامنِ اُحد میں کل تین ہزار کفار آئے تھے اور اب یہ بارہ ہزار تھے۔ سورۃ الاحزاب میں اس کا نقشہ بایں الفاظ کھینچا گیا ہے:

﴿اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝۱۰ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝۱۱﴾

''(اے مسلمانو!) یاد کرو جب لشکر پر لشکر آ رہے تھے تمہارے اوپر سے بھی اور تمہارے نیچے سے بھی' اور جب آنکھیں (وحشت و حیرت سے) پھرنے لگیں اور (خوف و ہراس سے) دلوں کا یہ حال تھا کہ وہ گویا گلوں میں آ کر اٹک گئے ہیں اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے۔ اُس وقت اہل ایمان کی خوب آزمائش کی گئی اور وہ بری طرح ہلا ڈالے گئے۔''

مدینہ حجاز کا شہر ہے' اس کے دائیں طرف کا علاقہ اونچا ہے' جسے نجد کا علاقہ کہتے ہیں۔ ادھر سے جو لشکر آ رہے تھے اُن کے متعلق ''مِّنْ فَوْقِكُمْ'' کے الفاظ آئے۔ ساحل کی طرف ڈھلوان ہے' اُدھر سے قریش چل کر آئے تھے' ان کے متعلق ''مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ'' فرمایا کہ وہ نیچے سے آ رہے تھے۔ مزید برآں شمال سے یہود آئے اور ان سب نے مل کر مدینہ کو گھیرے میں لے لیا۔ اُس وقت اہلِ ایمان جانچے گئے' پرکھے گئے کہ کون کتنے پانی میں ہے' اُن کے اندر واقعتاً کتنا ایمان ہے' کون جھوٹ موٹ کا عاشقِ رسول بنا ہوا تھا اور کون واقعتاً تن من دھن کی قربانی کا فیصلہ کر کے آیا تھا۔ ایسی خوفناک صورت حال ہوگئی تھی کہ بظاہر احوال بچنے کی کوئی صورت سامنے نہیں تھی۔ کس کس کا مقابلہ کریں گے؟ مدینہ کی چھوٹی سی بستی ہے جو لشکروں کی یلغار میں گھر گئی ہے۔ ادھر مارِ آستین بنو قریظہ موجود ہیں جو کسی بھی وقت پیچھے سے خنجر گھونپ سکتے ہیں۔

خندق کی تیاری

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے خندق کھودی گئی۔ جس طرح غزوۂ اُحد میں مشورہ ہوا تھا' اسی پر یہاں بھی عمل ہوا۔ خندق کھودی جا رہی ہے' سنگلاخ زمین ہے' سردی کا شدید موسم ہے' کھانے کو کچھ نہیں ہے' باغات سارے دشمنوں کے قبضے میں آ چکے ہیں' چاروں طرف سے محاصرہ اور ناکہ بندی ہے۔ کھانے کو کہاں سے آئے گا؟ فاقے پر فاقہ ہے' لوگوں نے اپنے پیٹوں پر پتھر باندھے ہوئے ہیں۔ محض محاورۃً نہیں' واقعتاً ایسا ہی ہے' تاکہ نقاہت کی وجہ سے کمر دوہری نہ ہو جائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس حال میں جرأتِ مؤمنانہ اور ہمت مردانہ کے ساتھ خندق کی کھدائی کر رہے ہیں اور زبانوں پر یہ ترانہ ہے:

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا

عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا

''ہم ہیں وہ لوگ جنہوں نے محمد ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ ہم نے جہاد پر بیعت کی ہے جب تک ہماری جان میں جان ہے!''

جبکہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ ہیں:

اَللّٰهُمَّ اِنَّ الْعَيْشَ عَيْشُ الْاٰخِرَةِ

فَاغْفِرْ لِلْاَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَةْ(۱)

''اے اللہ! اصل زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے' اصل عیش تو بس آخرت کا عیش ہے! پس تو مغفرت فرما دے انصار کی بھی اور مہاجرین کی بھی!''

خندق کی کھدائی میں نبی اکرم ﷺ بھی بنفس نفیس شریک تھے اور بھاری بھاری پتھر اٹھا کر باہر پھینک رہے تھے۔ یہ نقشہ نہیں تھا کہ آپؐ کہیں خیمے میں گاؤ تکیہ لگائے آرام سے بیٹھے ہوں۔ آپؐ بالکل عام مسلمانوں کی طرح کام کر رہے تھے۔ اور جب کچھ لوگوں نے آ کر اپنے کُرتے اٹھا کر دکھائے کہ حضورؐ! ہم نے فاقہ کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھے

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر کے متعدد ابواب۔ وصحیح مسلم' کتاب الجهاد والسیر' باب غزوة الاحزاب۔ الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ یہ اشعار صحیحین میں متعدد مقامات پر نقل ہوئے ہیں۔

ہوئے ہیں' تو آپ ﷺ نے اپنا کرتہ اٹھا کر دکھایا کہ وہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

امتحان یقیناً شدید تھا اور صورت حال انتہائی خطرناک اور مخدوش تھی۔ قرآن مجید نقل کرتا ہے کہ اس آزمائش کا نتیجہ کیا نکلا۔ جن کے دلوں میں روگ یعنی نفاق تھا' انہوں نے برملا کہا کہ: ﴿مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲﴾﴾ (الاحزاب) ''ہم سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو وعدے کیے تھے وہ جھوٹے نکلے''۔ انہوں نے ہمیں دھوکہ دیا اور ہمیں سبز باغ دکھا کر مروا دیا۔ ہم سے تو کہا گیا تھا کہ قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں تمہارے قدموں میں ہوں گی' جبکہ اس وقت ہم رفع حاجت کے لیے بھی باہر نہیں نکل سکتے۔ ہمارے کھانے کو کچھ نہیں' فاقے پر فاقے آ رہے ہیں۔

دوسری طرف جن کے دلوں میں ایمان تھا وہ اس صورت حال میں پکار اٹھے: ﴿هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾ (الاحزاب:۲۲) ''یہی تو ہے جس کا وعدہ کیا تھا ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے' اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی''۔ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ حق ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ عرب و عجم پر تمہیں غلبہ حاصل ہوگا' اور قرآن میں یہ وعدہ بھی کیا گیا تھا:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۵۵)

''اور ہم تمہیں لازماً آزما کر رہیں گے کسی قدر خوف و خطر سے' فاقہ کشی سے' اور جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے۔''

یہ آیات سورۃ البقرۃ کی ہیں جو غزوۂ بدر سے بھی پہلے نازل ہو چکی ہے۔ فرمایا کہ مسلمانو! ہم تمہیں آزمائیں گے' خوف ہوگا' خطرہ ہوگا' بھوک اور فاقہ ہوگا' مال کا نقصان بھی ہوگا' جانی ضیاع بھی ہوگا' کیے دھرے پر پانی پھر جائے گا' فصلیں اُجڑیں گی' غرض سب کچھ ہوگا۔ اہل ایمان کی اس آیت پر نگاہ تھی' اس لیے کہا کہ یہی تو ہے جس کا وعدہ کیا تھا ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے' اور بالکل سچا وعدہ کیا تھا اللہ اور اس کے رسول نے! دیکھئے ایک ہی صورتِ حال ہے' جس کے نتیجے دو نکل رہے ہیں۔ جس طرح ایک ہی کتاب ہے

قرآن مجید' مگر: ﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ﴾(البقرۃ:۲۶) ''اس سے اللہ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے!'' اسی طرح ایک ہی situation ہے غزوۂ اَحزاب کی' مگر نتیجے دو نکل رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اصل فیصلہ کن چیز انسان کے اندر کی کیفیت ہے۔

نصرتِ الٰہی کا ظہور

غزوۂ اَحزاب میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو اپنی خصوصی نصرت و تائید سے نوازا اور جس قدر خوفناک صورت بنی تھی' اُسی قدر معجزانہ طور پر معاملہ ختم ہو گیا۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کی تدبیر کو بھی بڑا دخل ہے' لیکن آخری فیصلہ کن چیز تائیدِ الٰہی ہے۔ ایک شب ایسی زبردست آندھی آئی کہ کفار و مشرکین کے خیمے اکھڑ گئے' دیگیں جو چولہوں پر چڑھی ہوئی تھیں الٹ گئیں اور خیموں میں آگ لگ گئی' ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔ اس افراتفری کے عالم میں رسول اللہ ﷺ نے انتہائی حکیمانہ اقدامات فرمائے' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کفار میں پھوٹ پڑ گئی اور آپس میں بے اعتمادی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے اپنے اپنے خیمے اٹھائے اور اپنے اپنے علاقوں کی طرف کوچ کر گئے اور فضا ایسے صاف ہو گئی کہ جیسے کچھ تھا ہی نہیں۔

ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اس غزوۂ احزاب کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کا امتحان لینا تھا کہ کون کتنے پانی میں ہے' سب جان لیں کہ ان میں کون منافق ہیں اور کون وہ ہیں جو کڑی سے کڑی آزمائش میں بھی ثابت قدم رہ سکتے ہیں! پس یہ واضح ہو گیا۔

غزوۂ خندق کے بعد نبی اکرم ﷺ نے یہ تاریخی الفاظ فرمائے: ((لَنْ تَغْزُوَكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ))(۱) ''مسلمانو! اب اس سال کے بعد قریش تم پر حملہ آور نہیں ہو سکیں گے' اب تم ان پر حملہ آور ہو گے''۔ اب پانسہ مسلمانوں کے حق میں پلٹ چکا تھا۔ کفر جتنی جمعیت اور تیاری کے ساتھ اُس وقت آیا تھا اس سے زیادہ تیاری ممکن نہیں تھی۔ نبی اکرم ﷺ کو بخوبی اندازہ تھا کہ اس ناکامی کے بعد اب کفار و مشرکین میں حوصلہ نہیں کہ دوبارہ اتنے اہتمام کے ساتھ آئیں۔ یہ واقعہ ۵ ہجری کا تھا۔

(۱) تفسیر ابن کثیر ۳۹۶/۶۔ راوی محمد بن اسحاق۔

صلح حدیبیہ: فتح مبین

اگلے سال ۶ھ میں رسول اللہ ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھی اہل ایمان عمرہ ادا کر رہے ہیں۔ چونکہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے لہٰذا آپؐ نے بغرضِ عمرہ مکہ مکرمہ کا سفر اختیار کرنے کا اعلان فرما دیا اور چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ ہدی کے جانور لے کر روانہ ہوئے۔ احرام بندھا ہوا ہے' تلواریں ساتھ ہیں لیکن نیاموں میں بند' کوئی اور ساز و سامان ساتھ نہیں۔ اُدھر قریش سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں! وہ آنحضور ﷺ کا راستہ روک نہیں سکتے۔ اس لیے کہ اس دوران میں یہی تو نہیں ہوا کہ آپ ﷺ بس مدینہ منورہ ہی میں کام کرتے رہے ہوں' بلکہ آس پاس دعوت پہنچ رہی ہے' قبائل میں بھی اب آپؐ کے جان نثار موجود ہیں۔ گویا اب قریش تنہا (isolate) ہو رہے ہیں۔ قریش کے نزدیک مسلمانوں کا سفر عمرہ ایک نوع کی چڑھائی تھی اور انہیں یہ کسی طرح گوارا نہیں تھا کہ اس طرح شکست قبول کر لیں۔ اس کے بعد تو عرب میں ان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہتی۔ رسول اللہ ﷺ حدیبیہ تک پہنچ گئے۔ قریش کی طرف سے سلسلۂ جنبانی شروع ہوا کہ کیا کرنا چاہیے۔ پہلے تو رعب ڈالا گیا' سفارتیں آئیں۔ ان میں عروہ بن مسعود ثقفی بہت بڑے سفیر تھے' جو بعد میں ایمان لے آئے۔ وہ یہاں آ کر تو اہل ایمان کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے تھے' مگر وہاں جا کر انہوں نے خبر دی کہ اے قریش! میں نے قیصر و کسریٰ کے دربار دیکھے ہیں' لیکن محبت اور جان نثاری کا جو جذبہ میں نے محمدؐ کے ساتھیوں میں محمدؐ کے لیے دیکھا ہے وہ کہیں اور نہیں دیکھا۔ لہٰذا عافیت اسی میں ہے کہ صلح کر لو۔

عروہ بن مسعود کے اس اظہارِ خیال پر مکہ میں بہت شور و غوغا ہوا' لیکن آخر کار قریش مصالحت پر آمادہ ہو گئے۔ گفتگو کے لیے قریش کی طرف سے سہیل بن عمرو آئے (جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے) اور انہوں نے ایسی شرائط پر مصالحت کا عندیہ دیا جو قریش کے لیے آبرومندانہ ہوں۔ گفت و شنید کے بعد صلح نامہ طے پا گیا۔ اس معاہدہ کی بعض شرائط نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے بظاہر بڑی سبکی کا باعث اور توہین آمیز تھیں۔ قریش نے پہلی شرط ہی یہ رکھی تھی کہ اس سال آپ کو بغیر عمرہ کیے واپس جانا

ہوگا' البتہ اگلے سال آپ لوگ آئیں' ہم تین دن کے لیے مکہ کو خالی کر دیں گے اور خود پہاڑوں پر چلے جائیں گے۔ معاہدے کی ایک شرط یہ تھی کہ اگر مکہ کا کوئی شخص اپنے والی یا سرپرست کی اجازت کے بغیر مدینہ جائے گا تو مسلمان اسے واپس لوٹانے کے پابند ہوں گے' لیکن اگر کوئی مسلمان مرتد ہو کر ہمارے پاس آئے گا تو ہم اسے واپس نہیں کریں گے۔ نبی علیہ السلام مسکرا رہے ہیں' شرط پر شرط مان رہے ہیں' جبکہ مسلمان پیچ وتاب کھا رہے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم دب کر صلح کیوں کر رہے ہیں؟ سب سے زیادہ شدت کے ساتھ اضطراب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو لاحق ہو گیا' جن کے بارے میں خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ((اَشَدُّهُمْ فِيْ اَمْرِ اللّٰهِ عُمَرُ))(۱)۔ ان کے لیے یہ چیز کسی درجے میں بھی قابل قبول نہیں تھی۔ دوڑتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا ہم حق پر نہیں؟ انہوں نے فرمایا: ''یقیناً ہیں''۔ کہنے لگے: ''تو پھر یہ کیا ہو رہا ہے! ہم دب کر صلح کیوں کر رہے ہیں؟'' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور آپ وہی کرتے ہیں جس کا آپ کو حکم ہوتا ہے!'' پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''حضور! کیا آپ حق پر نہیں ہیں اور کیا آپ اللہ کے نبی نہیں ہیں؟'' آنحضور ﷺ نے مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''کیوں نہیں؟ یقیناً میں حق پر ہوں اور اللہ کا نبی ہوں!'' پھر عرض کیا: ''پھر ہم اس طرح کا معاملہ کیوں کر رہے ہیں؟ کیا اللہ ہمارے ساتھ نہیں ہے؟'' آنحضور ﷺ نے پھر مسکراتے ہوئے فرمایا: ''یقیناً اللہ میرے ساتھ ہے اور میں اُس کا نبی ہوں اور میں وہی کچھ کر رہا ہوں جس کا مجھے حکم ہے''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر نبی اکرم ﷺ سے جو ذرا تیکھے انداز میں گفتگو کی تھی اس کا انہیں ساری عمر قلق رہا۔ بعض لوگ جن کے دلوں میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دشمنی اور بغض وعناد ہے' وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طرزِ تخاطب کو رسول اللہ ﷺ کی گستاخی پر محمول

---

(۱) سنن الترمذی' کتاب المناقب' باب مناقب معاذ بن جبل ..... سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں الفاظ ہیں: ((وَاَشَدُّهُمْ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ عُمَرُ))

کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ تو حمیتِ حق کا جذبہ تھا جس کی بنا پر ان کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ اس موقع پر حمیتِ حق کے اسی جذبے کا اظہار حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ہوا تھا جو یہ معاہدہ تحریر کر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ عبارت تحریر (dictate) کرائی: ''یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ اور قریش کے درمیان طے پایا'' تو سہیل بن عمرو نے فوراً اعتراض کیا کہ ''ہمیں آپ کے نام کے ساتھ ''رسول اللہ'' کے الفاظ منظور نہیں ہیں' اگر ہم آپ کو رسول اللہ مان لیتے تو جھگڑا کاہے کا تھا؟'' اس پر نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ''محمد رسول اللہ'' کے الفاظ مٹا دو اور اس کی جگہ ''محمد بن عبداللہ'' لکھ دو۔ حضرت علیؓ نے جواب میں عرض کیا کہ ''حضورؐ میں یہ کام نہیں کر سکتا''۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ وہ الفاظ کہاں ہیں' اور انہیں خود اپنے ہاتھ سے مٹا دیا۔ پھر وہاں لکھا گیا کہ ''یہ معاہدہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب اور قریش کے مابین طے پایا''۔ اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی حکم عدولی کی' مگر ایسا ہرگز نہیں ہے' بلکہ وہ ''محمد رسول اللہ ﷺ'' کے الفاظ لکھنے کے بعد انہیں مٹانا سوءِ ادب خیال کر رہے تھے۔

ابھی اس معاہدے کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ سہیل بن عمرو کے صاحبزادے ابوجندل رضی اللہ عنہ کسی طرح وہاں آ پہنچے۔ وہ مکہ میں ایمان لا چکے تھے اور اس کی پاداش میں سہیل بن عمرو نے انہیں بیڑیوں اور زنجیروں میں جکڑ کر ایک کوٹھڑی میں بند کر رکھا تھا۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر تشریف فرما ہیں تو وہ کسی نہ کسی طرح اپنی بیڑیاں توڑ کر چھپتے چھپاتے آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے اور عرض کیا کہ حضورؐ! مجھے اپنے ساتھ لے چلیے' انہوں نے میرا جو حشر کیا ہے وہ دیکھ لیجیے۔ سب مسلمان ان کی حالت زار کو دیکھ رہے ہیں۔ سہیل بن عمرو نے کہا کہ معاہدے کی شرائط کی رو سے ابوجندل کو میرے حوالے کر دیجیے۔ رسول اللہ ﷺ نے ابوجندلؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''ابوجندل! صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اور دوسروں کے لیے جو ان حالات میں مظلومانہ طور پر مقید ہیں' کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گا' ہم صلح کی شرائط

طے کر چکے ہیں اور ان کی رو سے ہم پابند ہیں کہ تمہیں واپس کر دیں''۔ چنانچہ سہیل اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ واپس لے گئے۔ اُس وقت مسلمانوں کے دلوں پر جو بیت رہی ہو گی اس کا اندازہ کر لیجیے۔

صلح حدیبیہ کے ثمرات

اس معاہدے کو قرآن مجید نے ''فتح مبین'' قرار دیا اور حدیبیہ سے واپسی پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ①﴾ (الفتح) ''(اے محمدؐ!) یقیناً ہم نے تو آپ کو کھلی فتح عطا کی ہے''۔ اور وہ واقعتاً کھلی فتح ثابت ہوگئی۔ یہ معاہدہ ہر اعتبار سے رسول اللہ ﷺ اور اہلِ ایمان کے حق میں پڑا اور مسلمانوں کے خلاف جنگی سرگرمیاں اور جتھے بندیاں ختم ہوگئیں۔ درحقیقت اس معاہدے کا مطلب یہ تھا کہ قریش نے محمد رسول اللہ ﷺ کو ایک ''طاقت'' کی حیثیت سے تسلیم (recognize) کر لیا۔ صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کی دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں عروج پر پہنچ گئیں۔ اس مرحلے پر اسلام کو اپنی دعوت کی اشاعت کے لیے امن درکار تھا جو اس صلح سے حاصل ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس مسخر کرنے والی اصل قوت قرآن مجید اور اس کی دعوت تھی۔ ع ''جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ!'' تلوار دل کو فتح نہیں کیا کرتی' دل کو فتح کرتا ہے قرآن مجید! جب تک جنگوں کا سلسلہ چل رہا تھا ادھر کما حقہٗ توجہ نہیں ہو رہی تھی۔ اب جو موقع ملا تو بیرونی اور اندرونی دونوں سطحوں پر دعوت و تبلیغ کا عمل پوری شدت سے شروع ہو گیا۔ اصحابِ صُفّہ کی جو جماعت تیار ہو رہی تھی اُس میں سے پچاس کو اِدھر بھیج دیا' سو کو اُدھر بھیج دیا' ستر کو اُدھر بھیج دیا۔ اُن میں بے چارے وہ بھی تھے جن کو شہید کر دیا گیا۔ ایسا بھی ہوا کہ بعض لوگوں نے درخواست کی کہ ہمارے علاقے میں کچھ لوگ بھیجئے جو ہمیں قرآن پڑھائیں' اور پھر کہیں گھاٹی میں لے جا کر انہیں شہید کر دیا۔ بئر معونہ کے واقعہ میں ستر اصحابِ صُفّہ میں سے شاید ایک صاحبؓ بچ سکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود دعوتی عمل پوری شدت کے ساتھ شروع ہو چکا تھا۔ دل فتح ہو رہے تھے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر قریش سمجھ گئے کہ ہمارے تو ہاتھ بندھ گئے۔

حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ جنہیں نبی اکرم ﷺ نے معاہدے کی رو سے واپس کر دیا تھا' کچھ دنوں کے بعد دوبارہ اپنی قید سے فرار ہوئے اور بحیرۂ احمر کے ساحل کے قریب جنگل میں پناہ لی۔ اب مکہ سے کوئی مسلمان کفار کی اسیری سے نکل بھاگتا تھا تو وہ مدینہ کو نہیں جاتا تھا کہ اسے واپس کر دیا جائے گا' بلکہ ابوجندلؓ سے آ کر مل جاتا۔ اس طرح ان لوگوں نے اس تجارتی شاہراہ پر جو ساحلِ سمندر کے قریب سے گزرتی تھی' اپنا ٹھکانہ بنا لیا اور قریش کے تجارتی قافلوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ ظاہر بات ہے کہ وہ اس معاہدے کے پابند نہیں تھے جو قریش نے رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا۔ اگر وہ مدینہ آتے تو آپؐ انہیں واپس کر دیتے۔ ان کی چھاپہ مار کارروائیوں سے تنگ آ کر قریش کا ایک وفد مدینہ آیا اور آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ معاہدہ کی اس شرط کو ہم خود واپس لیتے ہیں' اب مکہ سے جو بھی آپؐ کے پاس مدینہ آ کر آباد ہونا چاہے وہ آ سکتا ہے' ہم اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کریں گے' آپ خدا کے لیے ابوجندل اور اس کے ساتھیوں کو اپنے پاس بلا لیجیے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں مدینہ بلا لیا اور قریش کے قافلوں کا راستہ محفوظ و مأمون ہو گیا۔

صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کی دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں نہ صرف جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اپنے عروج کو پہنچ گئیں' بلکہ آپ ﷺ نے پہلی مرتبہ جزیرہ نمائے عرب سے باہر متعدد سلاطین کو دعوتی مکتوب ارسال فرمائے۔ اس طرح آپؐ کی دعوتی سرگرمیاں بیرونِ عرب بھی شروع ہو گئیں۔

اگلے سال ذوالقعدہ ۷ھ میں نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جم غفیر کے ہمراہ عمرۂ قضا ادا فرمایا اور طے شدہ شرائط کے مطابق تین دن تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے۔ معنوی طور پر یہ قریش کی زبردست شکست تھی اور نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ادائے عمرہ سے ان کی ساکھ کو شدید نقصان پہنچا تھا۔

صلح حدیبیہ کا خاتمہ

صلح حدیبیہ کے موقع پر بنوخزاعہ نبی اکرم ﷺ کے حلیف بن گئے تھے اور ان کے

حریف بنو بکر قریش کے حلیف ہو گئے تھے۔ صلح حدیبیہ کے قریباً دو سال بعد بنو بکر نے رات کی تاریکی میں بنو خزاعہ پر اچانک حملہ کر دیا' جس کے نتیجے میں بنو خزاعہ کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ قریش کے سردار بھی بھیس بدل کر اس شب خون میں شریک ہوئے اور تلواریں چلائیں۔ مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنو خزاعہ کا وفد رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا اور فریاد کی کہ ہمارے ساتھ یہ ظلم ہوا ہے' اب صلح حدیبیہ کی رو سے آپؐ بنو بکر اور قریش سے ہمارا بدلہ لیں۔ نبی اکرم ﷺ نے قریش کے پاس سفارت بھیجی اور تین شرائط پیش کیں۔ پہلی یہ کہ مقتولوں کا خون بہا ادا کر دو۔ دوسری یہ کہ اگر تم اس کے لیے تیار نہیں ہو تو بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جاؤ۔ تیسری یہ کہ اگر یہ بھی منظور نہیں تو اعلان کر دو کہ صلح حدیبیہ ختم ہو گئی۔ قریش کے مشتعل مزاج لوگوں نے یہ شرائط سنتے ہی فوراً کہا کہ ہمیں تو صرف تیسری شرط منظور ہے' بس آج سے صلح حدیبیہ ختم! ہمارے اور محمد (ﷺ) کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں!!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس بات کے منتظر تھے کہ قریش کی طرف سے معاہدہ کی خلاف ورزی ہو اور آپؐ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ آپؐ نے اس موقع کو ایسی مضبوطی سے پکڑا کہ قریش پر فوراً یہ احساس طاری ہوا کہ ہم نے غلطی کی' ہم مارے گئے' صلح کی تجدید ہونی چاہیے' ہم محمد (ﷺ) کا مقابلہ نہیں کر سکتے' یہ ہم کیا کر بیٹھے؟ چنانچہ اب ابوسفیان صلح کی تجدید کی درخواست لے کر خود مدینہ پہنچے' لیکن بارگاہِ رسالت سے کوئی جواب نہیں ملا۔ دیکھیے! دو سال پہلے آنحضور ﷺ نے بظاہر دب کر صلح کی' مگر اب آنحضور ﷺ صلح نہیں کر رہے' کیوں؟ اس لیے کہ اب صلح کی تجدید کا مطلب کفر کو زندہ رہنے کی ایک مہلتِ تازہ (fresh lease of existence) دینا تھا' جو آنحضور ﷺ گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ آپؐ دیکھ رہے تھے کہ ان کی قوت ٹوٹ چکی ہے' ان میں مزاحمت موجود نہیں' مقابلہ کر نہیں سکتے تو اب انہیں صلح کی ڈھال کاہے کو دی جائے؟ اصل مقصد تو اللہ کے دین کو غالب کرنا ہے۔ اس میں تاخیر کس لیے؟ معلوم ہوا کہ اصل مطلوب نہ صلح ہے نہ جنگ' اصل چیز تو مقصد ہے' اور وہ ہے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۔

ابوسفیان صلح کی تجدید کی کوشش میں مدینہ منورہ آئے تو اپنی صاحب زادی اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کے گھر پہنچے جو نبی اکرم ﷺ کی زوجہ محترمہ اور اُمّ المؤمنین ہیں۔ یہ بڑی امیدیں لے کر گئے ہوں گے۔ وہاں عجیب واقعہ پیش آیا' گھر میں پہنچے' اللہ کے رسول ﷺ کا بستر بچھا ہوا تھا' اس پر بیٹھنے لگے تو بیٹی نے کہا کہ ذرا ٹھہریے ابا جان! بستر لپیٹ کر کہا کہ اب تشریف رکھیے! عرب کے اس مدبر سردار نے فوراً سوال کیا کہ بیٹی! کیا یہ بستر میرے لائق نہ تھا یا مَیں اس کے لائق نہ تھا؟ حضرت اُمّ حبیبہؓ نے کہا: ابا جان! آپ اس بستر کے لائق نہیں ہیں' یہ بستر جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا ہے اور آپ مشرک ہیں' آپ اس پر نہیں بیٹھ سکتے۔ اب وہ کیا سفارش کرواتے؟ وہاں سے نکلے۔ مسجد نبویؐ کے پاس کچھ درویش صحابہ رضی اللہ عنہم بیٹھے ہوئے تھے' انہوں نے ابوسفیان پر کوئی فقرہ چست کر دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پاس سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے ان درویش صحابہؓ کو سمجھایا کہ آخر قریش کا سردار ہے' ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو بھی کچھ جواب دے دیا' آخر درویش تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جا کر رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی۔ آپؐ نے فرمایا: ''ابوبکرؓ! کہیں ان کو ناراض تو نہیں کر آئے؟ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن سے یہ ناراض ہو جائیں ان سے اللہ بھی ناراض ہو جاتا ہے!'' بہرحال ابوسفیان کی تجدید صلح کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی اور وہ واپس لوٹ گئے۔

فتح مکّہ

رمضان ۸ ھ میں رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کن اقدام فرمایا اور دس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لشکر کے ہمراہ مکہ کا قصد فرمایا۔ اہل مکہ میں اب مزاحمت کا حوصلہ نہیں تھا۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کل آٹھ برس بعد فاتح کی حیثیت سے مکے میں داخل ہوئے اور انقلاب آ گیا۔ بالکل معمولی سی جھڑپ کہیں کہیں ہوئی ہے' اس لیے کہ قریش کو معلوم تھا کہ ہم کس پوزیشن میں ہیں۔ صورتِ حال یکسر تبدیل ہو چکی ہے اور نبی اکرم ﷺ دس ہزار جان نثاروں کے جلو میں فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ وقت گردنوں کے اکڑنے اور سینوں کے تننے کا ہوتا ہے' مگر یہاں یہ کیفیت ہے کہ محمد رسول

اللہ ﷺ کی گردن اتنی جھکی ہوئی ہے کہ جس سواری پر بیٹھے ہیں اس کی گردن سے آپؐ کی پیشانی مَس کر رہی ہے۔ اریحا شہر کی فتح کے وقت بنی اسرائیل کو حکم ہوا تھا: ﴿وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾ (البقرۃ:۵۸) ''اور دروازے میں سر جھکائے ہوئے داخل ہونا''۔ یعنی فاتح کی حیثیت سے داخل ہوں تو جھک کر داخل ہوں' اُس وقت غرور نہ ہو' استکبار نہ ہو۔ یہاں عملاً یہی کیفیت ہے۔ معافی کا اعلانِ عام ہو گیا کہ جو اپنے گھر میں رہے اسے بھی معاف کیا جاتا ہے' جو خانہ کعبہ میں آ جائے اسے بھی پناہ مل گئی۔ ابوسفیانؓ اب اسلام قبول کر چکے تھے۔ اعلان کر دیا گیا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے اسے بھی امان حاصل ہو گئی۔ اور پھر جب سب سردارانِ قریش گردن جھکائے سامنے آئے تو نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا کیا گمان ہے کہ مَیں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ ان کا جواب انتہائی خوشامدانہ تھا جو کسی عرب کی زبان پر آ سکتا ہے۔ وہ پکار اٹھے: اَخٌ کَرِیْمٌ وَابْنُ اَخٍ کَرِیْمٍ یعنی آپ ایک شریف اور بامروت بھائی ہیں اور ایک شریف اور بامروت بھائی کے بیٹے ہیں۔ رحمۃ للعالمین ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: ((لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ)) ''آج تم پر کوئی سرزنش نہیں ہے''۔ ((اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ)) ''جاؤ تم سب آزاد ہو۔''(۱)

غزوۂ حنین

رمضان ۸ھ میں مکہ کا فتح ہو جانا گویا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی اندرونِ عرب کامیابی کی علامت (symbol) تھا۔ لیکن کفر کی ایک آخری کوشش اور ہوئی۔ غیر قریش عرب قبائل نے مجموعی طور پر ایک دفعہ پھر کوشش کی کہ کسی طرح اس سیلاب کو روکا جائے۔ یہ ثقیف اور ہوازن کے قبائل تھے جو طائف اور اس کے اردگرد آباد تھے۔ یہ دونوں قبیلے بڑے جنگجو اور بڑے ماہر تیر انداز تھے۔ چنانچہ اگلے ہی مہینے شوال ۸ھ میں غزوۂ حنین پیش آ گیا۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اب بارہ ہزار کا لشکر تھا۔ دس ہزار مدینہ سے آئے تھے اور دو ہزار مکہ سے شامل ہو گئے تھے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو ابھی ایمان نہیں

(۱) فقه السیرة للالبانی' ح:۳۸۲۔

لائے تھے مگر ساتھ شامل تھے۔ اس موقع پر بعض مسلمانوں کی زبان سے اپنی کثرت کے زعم میں یہ الفاظ نکل گئے کہ ''آج مسلمانوں پر کون غالب آ سکتا ہے!'' اللہ تعالیٰ کو یہ گھمنڈ پسند نہ آیا' لہٰذا پہلے ہی ہلے میں دشمن کی طرف سے تیروں کی ایسی بوچھاڑ آئی کہ بھگدڑ مچ گئی اور بارہ ہزار کا لشکر تتر بتر ہو گیا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آنحضور ﷺ کے ساتھ صرف چار سو جان نثار باقی رہ گئے تھے۔ اس موقع پر نبی اکرم ﷺ کی ذاتی شجاعت کا سب سے بڑا اظہار ہوا۔ آپ ﷺ سواری سے اترے' عَلَم ہاتھ میں لیا اور یہ رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے آگے بڑھے:

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ! اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ!!(۱)

''میں اللہ کا نبی ہوں (اس میں ذرّہ برابر) جھوٹ نہیں ہے' میں عبدالمطلب (جیسے بہادر) کا بیٹا ہوں!''

پھر آپ ﷺ نے انصار و مہاجرین کو پکارا:

((یَا اَصْحَابَ السَّمُرَةِ! یَا مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ! یَا بَنِی الْحَارِث)) (۲)

''اے بیعت رضوان کرنے والو! اے گروہِ انصار! اے بنی الحارث!''

اللہ کے رسول ﷺ کی پکار سنتے ہی انصار و مہاجرین یہ کہتے ہوئے دفعتاً پلٹ پڑے کہ: لَبَّیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَیْكَ ' لَبَّیْكَ نَحْنُ بَیْنَ یَدَیْكَ (۳) —— پھر جو مسلمانوں نے جم کر حملہ کیا تو جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا اور وقتی شکست کامل فتح سے بدل گئی۔

قرآن حکیم میں غزوۂ حنین کا ذکر بایں الفاظ آیا ہے:

﴿..... وَّیَوْمَ حُنَیْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَیْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَیْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیْتُمْ مُّدْبِرِیْنَ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِیْنَ

(۱) صحیح البخاری ' کتاب المغازی' باب قول اللہ تعالی : وَیَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ .....وکتاب الجهاد' متعدد ابواب۔ وصحیح مسلم' کتاب الجهاد' باب غزوة حنین۔

(۲) مسند احمد۔

(۳) صحیح البخاری' کتاب المغازی' باب غزوة الطائف۔

كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶﴾

''.....اور غزوۂ حنین کے دن کو یاد کرو جب تمہیں اپنی کثرتِ تعداد کا غرّہ ہو گیا تھا' مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی تمام تر وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی' پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مؤمنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور کافروں کو سزا دی۔ اور یہی بدلہ ہے کافروں کا۔''

چنانچہ مؤمن کو صرف اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے' اسباب و وسائل پر نہیں۔ ﴿اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾ کی رو سے سارا ساز و سامان تیار کیا جائے' لیکن بھروسہ صرف اللہ پر ہو۔

فراستِ نبویؐ کا عظیم مظاہرہ

غزوۂ حنین میں بڑا مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ اس کی تقسیم کے وقت نبی اکرم ﷺ نے ان لوگوں کو زیادہ نوازا جو فتح مکہ کے بعد نئے نئے ایمان لائے تھے' تاکہ ان کی تالیفِ قلب ہو' جو صدقات کی تقسیم کے ضمن میں قرآن کا بیان کردہ ایک مصرف ہے۔ لیکن منافقین نے اس معاملے کو خوب اچھالا۔ عجیب انداز میں کہا گیا کہ جب خون دینے اور جانیں دینے کا وقت آتا ہے تو ہم (انصار) یاد آتے ہیں اور اب مالِ غنیمت بانٹنے کا وقت آیا تو اپنے گھر والے' اپنے خاندان والے اور اپنے قبیلے والے یاد آ گئے۔ اس اعتبار سے تو یہ بات غلط نہیں تھی کہ اُس وقت جو مؤلفۃ القلوب تھے وہ مکہ کے لوگ تھے جو رسول اللہ ﷺ کے کنبے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے مسلمانوں میں ایک عام بے چینی پھیل گئی۔ عجیب انداز میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ آنحضور ﷺ کو بھی یہ سب خبریں پہنچ رہی تھیں۔ نبی اکرم ﷺ نے اس نازک اور پیچیدہ صورت حال کو جس عمدگی سے حل فرمایا وہ آپؐ کی فراست اور حسنِ تدبر کا شاہکار ہے۔ آپ ﷺ نے ایک بہت بڑا خیمہ نصب کروایا اور تمام انصارؓ کو وہاں جمع کر لیا۔ وہاں آپؐ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جو فصاحت و بلاغت اور فراست و ذکاوت کے علاوہ نفسیاتِ انسانی کے ادراک میں بھی آپؐ کی مہارت کا شاہکار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے اہل یثرب!

کیا یہ درست نہیں کہ تم گمراہ تھے' اللہ نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت دی؟'' انہوں نے بیک زبان کہا: بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! (کیوں نہیں' اے اللہ کے رسول!) پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے گروہِ انصار! کیا یہ درست نہیں کہ تم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے' اللہ نے میرے ذریعے تمہارے دلوں میں محبت پیدا کر دی؟'' انہوں نے پھر کہا: بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! ظاہر ہے کہ ان باتوں کا تو انکار ممکن ہی نہیں۔ آپ ﷺ نے وہ سارے احسانات گنوائے جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی وساطت سے انصار پر کیے۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے خطاب کا رُخ بدلا اور فرمایا: ''اے اہل یثرب! تم جواب میں یہ کہہ سکتے ہو کہ اے محمد (ﷺ) جب آپؐ کی قوم نے آپؐ کو جھٹلا دیا تو ہم آپؐ پر ایمان لائے اور آپؐ کی تصدیق کی۔ میں جواب میں کہوں گا کہ تم صحیح کہتے ہو''۔ پھر فرمایا: ''تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جب آپؐ کے دشمنوں نے آپؐ کو ہجرت پر مجبور کر دیا اور آپؐ کو کوئی پناہ دینے والا نہیں تھا تو ہم نے آپؐ کو پناہ دی اور اپنے اہل وعیال سے بڑھ کر آپؐ کی حفاظت کی۔ تو میں کہوں گا تم درست کہتے ہو۔ تو اے معشرِ انصار! کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں کہ لوگ بھیڑیں' بکریاں اور اونٹ لے کر اپنے گھروں کو جائیں اور تم محمد رسول اللہ (ﷺ) کو لے کر اپنے گھروں کو واپس لوٹو؟'' اس پر شدتِ جذبات سے تمام انصار کی چیخیں نکل گئیں اور سب پکار اٹھے: ''رَضِیْنَا' رَضِیْنَا'' (ہم راضی ہیں' ہم راضی ہیں!) یعنی ہمیں نہ اونٹ چاہئیں اور نہ بھیڑ بکریاں' ہمیں تو صرف اللہ کے رسول محمد ﷺ درکار ہیں۔ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے انصار کے سامنے یہ حکمت بیان فرمائی کہ مکہ کے لوگ تازہ ایمان لائے ہیں' ان کو جو کچھ دیا گیا ہے وہ کسی ناحق جانبداری کی بنا پر نہیں' بلکہ تالیفِ قلب کے لیے دیا گیا ہے۔(۱)

بہرحال اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی بھی انقلابی جدوجہد کی راہ میں جتنی مشکلات اور رکاوٹیں آ سکتی ہیں وہ ہمیں آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں بتمام وکمال نظر آتی ہیں۔

---

(۱) صحیح البخاری ' کتاب المغازی' باب غزوۃ الطائف ..... وصحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب اعطاء المؤلفۃ قلوبھم ..... (اس واقعہ کی تفاصیل مختلف احادیث میں آئی ہیں۔)

بارہا آپ ﷺ کو پیچیدہ سے پیچیدہ صورت حال سے عہدہ برآ ہونا پڑا۔ ایک ایک قدم پر کوئی نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا تھا۔

مشرکینِ عرب کو آخری تنبیہ

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کا تدبّر ملاحظہ کیجیے کہ پہلا حج جو آیا وہ آپ نے مشرکین کے زیر اہتمام رہنے دیا۔ مسلمانوں اور مشرکین نے مل کر اپنے اپنے طریقے سے حج کیا۔ لیکن اگلے سال آپ ﷺ نے مشرکین کے ہاتھ سے انتظام لے لیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیرِ حج بنا کر بھیجا۔ مدینہ سے قافلہ آیا لیکن نبی اکرم ﷺ خود تشریف نہیں لائے۔ اس حج میں بھی مشرکین کی شرکت کی اجازت برقرار رکھی گئی۔ حج کے لیے قافلہ روانہ ہو چکا تھا کہ چند دنوں بعد سورۃ التوبۃ کی پہلی چھ آیات نازل ہوئیں' جن میں مشرکین سے اعلانِ براءت ہے اور انہیں صرف اَشْهُرٍ حُرُم کی مہلت دی جا رہی ہے کہ اس چار ماہ کے عرصے میں ایمان لے آئیں تو عافیت ہے' اگر اپنے شرک و کفر پر اڑے رہیں تو پھر اُن کا قتلِ عام شروع ہو جائے گا۔ میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ جس قوم پر رسول کی بعثت کی حجت قائم ہو چکی ہو اور وہ انکار کر دے تو اس کے لیے رعایت نہیں برتی جاتی۔ چنانچہ جس ضابطے کے تحت قومِ نوحؑ' قومِ ہودؑ' قومِ صالحؑ وغیرہ ہلاک کی گئیں وہی ضابطہ اب اہلِ عرب پر لاگو ہو رہا تھا۔ سورۃ المزمل میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۝١٥ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ۝١٦﴾

''تم لوگوں کی طرف ہم نے اُسی طرح ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا۔ (پھر دیکھ لو جب) فرعون نے اُس رسول کی بات نہ مانی تو ہم نے اس کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔''

تو اگر آلِ فرعون غرق کیے گئے تو تمہارے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوگا۔ تم یا تو ایمان لے آؤ یا پھر تم پر اللہ کے عذاب کا کوڑا برس کر رہے گا۔ عذابِ خداوندی کی صورتیں بدل سکتی ہیں۔ کبھی وہ زمین پر زلزلے کی شکل میں آ سکتا ہے' کبھی وہ آسمان سے بارش اور طوفان

کی صورت میں آ سکتا ہے اور کبھی مسلمانوں کی تلواروں کی صورت میں آ سکتا ہے۔ سورۃ التوبۃ کی ان آیات میں مشرکینِ عرب کو اس عذاب سے خبردار کر دیا گیا اور پانچویں آیت میں ان کے لیے دوٹوک انداز میں عذابِ استیصال کا اعلان کر دیا گیا۔ فرمایا:

﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''پس جب حرمت والے مہینے ختم ہو جائیں تو قتل کرو ان مشرکوں کو جہاں بھی پاؤ' اور ان کو پکڑو' ان کا محاصرہ کرو اور ان کی خوب خبر لینے کے لیے ہر گھات میں بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کریں (یعنی ایمان لے آئیں) اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا رحم فرمانے والا ہے۔''

ان آیات کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس ہدایت کے ساتھ مکہ روانہ فرمایا کہ حج کے موقع پر میدانِ عرفات میں کھڑے ہو کر آپ ﷺ کے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے یہ آیات حاضرین کو سنا دیں تاکہ تمام اہلِ عرب کو معلوم ہو جائے کہ اشہرِ حرم کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے مشرکینِ عرب کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا!

انقلابِ محمدیؐ کی تکمیل

سورۃ التوبۃ کی ابتدائی چھ آیات میں درحقیقت عرب سے شرک کے مکمل خاتمے اور قلع قمع (mopping-up operation) کا اعلانِ عام ہے کہ اب مشرکین کے لیے کوئی رعایت نہیں ہے۔ چنانچہ ان چار ماہ کے دوران تمام مشرک ایمان لے آئے اور اسلام کے خلاف مزاحم قوتوں کا بالکلیہ خاتمہ ہو گیا۔ اس کیفیت کو قرآن حکیم میں بایں الفاظ بیان کیا گیا ہے:

﴿اِذَا جَاۗءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝﴾ (النصر)

''جب پہنچ چکی اللہ کی مدد اور (حاصل ہو گئی) فتح۔ تو تم نے دیکھا لوگوں کو اللہ کے

دین میں داخل ہوتے فوج در فوج۔''

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو تارکِ وطن ہو کر چلے گئے۔ ابوجہل کے صاحب زادے عکرمہ بھی ایمان لانے پر آمادہ نہ ہوئے اور مکہ چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن عجیب واقعہ ہوا۔ حبشہ کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں طوفان آ گیا۔ جس کشتی میں سوار تھے وہ ڈولنے لگی۔ اس پر سب لوگوں نے اللہ کو پکارنا شروع کیا۔ وہ خود کہتے ہیں مَیں نے سوچا کہ اسی کی دعوت تو محمد (ﷺ) دیتے ہیں! اِس وقت کسی لات' کسی ہبل' کسی عزّیٰ کو کوئی نہیں پکار رہا' خطرے کے وقت پکارا ہے تو سب نے ایک اللہ کو پکارا ہے۔ لہٰذا واپس آئے اور ایمان لے آئے۔ بہرحال اس ایک سال میں پورے جزیرہ نمائے عرب سے شرک اور کفر کا مکمل صفایا ہو گیا۔

حجۃ الوداع

اگلے سال ۱۰ھ میں نبی اکرم ﷺ نے فریضۂ حج ادا فرمایا۔ ہجرت کے بعد یہی آپؐ کا پہلا اور آخری حج ہے۔ اسی لیے اسے حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس حج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنا مشن اُمت کے سپرد فرما دیا۔ سورۃ المائدۃ کی یہ آیت بھی اسی موقع پر نازل ہوئی:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ﴾ (آیت ۳)

''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور اسلام کو تمہارے لیے بطور دین پسند فرمایا۔''

اس موقع پر سرزمین عرب سے جمع ہونے والے سوا لاکھ مسلمانوں کا مجمع موجود تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے نہایت جامع خطبہ ارشاد فرمایا اور آخر میں لوگوں سے سوال کیا: ((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟)) ''لوگو! کیا میں نے پہنچا دیا؟'' پورے مجمع نے اقرار کیا: اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ ''ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے حق تبلیغ بھی ادا کر دیا' حق نصیحت بھی ادا کر دیا' حق امانت بھی ادا کر دیا''۔ حاضرین سے تین مرتبہ یہ اقرار لینے کے بعد آنحضور ﷺ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور فرمایا: ((اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ' اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ'

اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ))(۱) ''اے اللہ تو بھی گواہ رہ! اے اللہ تو بھی گواہ رہ' اے اللہ تو بھی گواہ رہ!'' پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ))(۲) یعنی اب وہ لوگ جو یہاں موجود ہیں' ان کی ذمہ داری ہے کہ اس دین کو ان تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں!

حجۃ الوداع کے بعد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے کُل ۸۰ دن بنتے ہیں' جس کے بعد آپؐ نے رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت فرمائی۔ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران جزیرہ نمائے عرب کی حد تک دونوں کام پورے ہو گئے۔ اہلِ عرب تک تبلیغ کا حق بھی ادا ہو گیا اور جزیرہ نمائے عرب کی حد تک دینِ اسلام کا غلبہ بھی ہو گیا۔ ازروئے: ﴿لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ﴾ اس طرح محمد رسول اللہ ﷺ کے فرضِ منصبی کا ایک مرحلہ (phase) تکمیل کو پہنچا۔ لیکن آپؐ صرف عرب کے لیے رسول بن کر نہیں آئے تھے' آپؐ کی بعثت تو تمام نوعِ انسانی کے لیے تھی۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾ (سبا:۲۸) اور: ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ (الانبیاء) چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں اپنی دعوت کے بین الاقوامی یا عالمی پہلو کا بھی آغاز فرما دیا۔ بعثتِ نبویؐ کا یہ بین الاقوامی پہلو اِن شاء اللہ آئندہ نشست میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مدنی دَور جُہدِ مسلسل کی بھرپور داستان ہے۔ اس ایک نشست میں ہم اس کا محض طائرانہ جائزہ ہی لے سکے ہیں اور اس دور کے بعض اہم واقعات بیان ہونے سے رہ گئے ہیں۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات ○○

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجۃ النبی ﷺ۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الحج' باب الخطبۃ ایام منی۔

سلسلۂ خُطبات ⑤

دعوتِ محمدیؐ کا بین الاقوامی مرحلہ
اور
خلافتِ صدّیقیؓ میں
انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا استحکام

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (الانبیاء)

﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (سبا)..... صدق اللہ العظیم

سیرت النبی ﷺ اور اُمتِ مسلمہ کی تاریخ کے سلسلے میں جو تقاریر اب تک ہو چکی ہیں ان میں پہلی دو تقریریں اصولی مباحث پر مشتمل تھیں: (۱) بعثتِ انبیاء کا عمومی مقصد کیا ہے؟ اور (۲) خاتم النبیین، آخر المرسلین، سیدا لانبیاء اور افضل المرسلین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی بنیادی کیفیات کیا ہیں؟ اس کے پس منظر میں آنحضور ﷺ کے اصل کارنامۂ حیات کا صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں تین باتیں آپ کے ذہن میں ہوں گی۔

ختمِ نبوت کا ایک مظہر تو یہ ہے کہ ہدایت اپنے تکمیلی مراحل کو پہنچ گئی ''الہدیٰ'' کی صورت میں ـــــ یا بالفاظِ دیگر قرآن حکیم کی صورت میں آسمانی ہدایت ہمیشہ ہمیش کے لیے نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوئی اور اس کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے ذمہ لے لیا۔ قرآن مجید سے متعلق ان دونوں اُمور کا براہِ راست تعلق ختمِ نبوت سے ہے۔ ختمِ نبوت کا دوسرا مظہر یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو ایک مکمل دین اور ایک مکمل نظامِ زندگی عطا کیا گیا' جو انسان کی انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ تمدن وتہذیب اور ہیئتِ اجتماعیہ کے ارتقائی مراحل کے دوران انسانی زندگی میں جو گوناگوں قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہوتی چلی گئیں' ان سب کا ایک متوازن اور معتدل حل اور ایک نظامِ عدل وقسط نبی اکرم ﷺ کو دینِ حق کی شکل میں دے دیا گیا' اور آپؐ کا فرضِ منصبی یہ قرار پایا کہ اس نظامِ عدل وقسط کو بالفعل قائم کر کے دکھا دیا جائے' تاکہ بنی نوع انسان پر حجت قائم ہو جائے۔ یہ حجت صرف اس اعتبار سے قائم نہ ہو کہ ہدایتِ خداوندی انفرادی زندگی سے متعلق ہے اور صرف انفرادی سیرت وکردار کے ضمن میں کامل ہدایت ملی ہے' بلکہ نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت اس صورت میں بھی ہو جائے کہ نظامِ اجتماعی سے متعلق بھی جو ہدایت دی گئی' اس کا بھی ایک عملی نمونہ دنیا میں قائم کر کے اور چلا کر دکھا دیا جائے کہ وہ کوئی خیالی جنت (Utopia) نہیں ہے' صرف نظری تعلیم نہیں ہے کہ جو قابلِ عمل نہ ہو' بلکہ وہ قابلِ عمل ہے' وہ نظام دنیا میں بڑے وسیع وعریض خطے پر قائم ہوا ہے اور اس کی برکات کا دنیا نے بچشمِ سر مشاہدہ کیا ہے۔

ختمِ نبوت کا تیسرا پہلو وہ ہے جس کے لیے آغاز میں دو آیات تلاوت کی گئیں۔ یعنی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پہلے اور آخری نبی ورسول ہیں جن کی بعثت علی الاطلاق پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ آپ ﷺ سے پہلے کسی نبی اور رسول کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لیے نہیں تھی۔ ویسے بھی ظاہر ہے کہ اس سے قبل انسانی تمدن نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی تھی' اور رسل ورسائل' حمل ونقل اور ابلاغ کے وسائل وذرائع بھی اتنے نہیں تھے کہ کسی ایک دعوت پر بنی نوع انسان کو مجتمع کیا جا سکتا۔ لہٰذا نبوتیں علاقائی (regional) بھی

تھیں اور موقّت بھی۔ ایک علاقے میں ایک نبی آئے' انہوں نے دعوت دی' قوم سے بایں الفاظ خطاب کیا:

﴿یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ﴾ (الاعراف)

''اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے''۔

حضرت نوح ہوں یا حضرت ہود' حضرت صالح ہوں یا حضرت شعیب علیہم الصلاۃ والسلام' قرآن میں ان کی دعوت کا ذکر بار بار اِن ہی الفاظ میں آتا ہے۔ ان کے بعد بھی بہت سے رسول آئے اور یہ سلسلہ جاری رہا۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے متصلاً قبل حضرت مسیح علیہ السلام تشریف لائے۔ حضرت مسیح علیہ السلام اور نبی اکرم ﷺ کے درمیان تقریباً چھ صدیوں کا وقفہ ہے' اور یہ نبوت و رسالت کا وقفہ ہے۔ ان چھ صدیوں میں نبوت و رسالت کا دروازہ بند رہا ہے اور پھر ایک دفعہ کھل کر ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔ اس لیے اس کو فترۃِ اُولیٰ کہتے ہیں۔ آخری فترۃ آنحضور ﷺ پر ہوئی اور اس سے پہلے تمہیداً چھ سو برس ایسے گزرے ہیں کہ پورے کُرۂ ارضی پر کوئی نبی اور رسول موجود نہیں تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں ایک مغالطہ ہو سکتا ہے' اس لیے کہ عیسائیت جیسے کہ دنیا میں آج موجود ہے' ایک بین الاقوامی مذہب کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اس سے یہ مغالطہ ہو سکتا ہے کہ شاید حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت کسی خاص قوم کی طرف نہیں تھی۔ اس مغالطے کی اصلاح کر لیجیے۔ قرآن مجید آپؑ کے بارے میں تعین کے ساتھ کہتا ہے: ﴿رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ.....﴾ (آل عمران:۴۹) یعنی آپؑ رسول تھے صرف بنی اسرائیل کی طرف۔ اور لطف یہ ہے کہ انجیل میں یہ الفاظ موجود ہیں:

''میں بنی اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں!''

حضرت مسیح علیہ السلام نے جب اپنے حواریین کو تبلیغ کے لیے بھیجا تو اُس وقت آپؑ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں انہیں کچھ ہدایات دیں۔ یہ بڑا پیارا خطبہ ہے۔ اس کے بعض جملے اس طرح کے ہیں:

''تم نے مفت پایا ہے' مفت تقسیم کرو' میں نے تم سے کوئی اجرت نہیں لی' تم بھی اپنی دعوت وتبلیغ کی کسی سے اُجرت وصول نہیں کرو گے!''

ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ:

''دیکھو! کوئی شخص اپنے بچوں کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈالا کرتا۔ میرے پاس ایک پیغام ہے جو صرف بنی اسرائیل کے لیے ہے''۔

لہٰذا حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت صرف بنی اسرائیل تک محدود تھی۔ یہ تو دراصل سینٹ پال تھا جس نے مسیح علیہ السلام کے اصل دین میں جہاں اور تغیّر وتبدّل کیا وہاں یہ تبدیلی بھی پیدا کی کہ اسے بین الاقوامی مذہب کا درجہ دے دیا۔ ورنہ نبی اکرم ﷺ اس مقدس گروہِ انبیاء ورُسل میں پہلے اور آخری نبی ورسول ہیں جن کی بعثت پوری نوعِ انسانی کی طرف علی الاطلاق ہوئی۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (الانبیاء)

''اور ہم نے تو آپؐ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

اور:

﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (سبا)

''اور ہم نے تو آپؐ کو تمام نوعِ انسانی کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے' لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔''

اور ایک خطبے میں نبی اکرم ﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ یہ خطبہ ''نہج البلاغہ'' میں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بالکل ابتدائی دَور کے خطبات میں سے ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

((اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ خَاصَّةً وَاِلَى النَّاسِ كَآفَّةً))

''لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف بالخصوص (کیونکہ مخاطب اہل عرب ہیں) اور پوری نوعِ انسانی کی طرف بالعموم!''

جیسا کہ گزشتہ نشست میں بیان کیا جا چکا ہے' بعثتِ خصوصی کی حد تک جو ذمہ داریاں تھیں وہ تو نبی اکرم ﷺ نے بنفسِ نفیس مکمل کر دیں۔ آپ ﷺ کو دو چیزیں دے کر بھیجا گیا تھا: ایک الہدیٰ یعنی قرآن مجید اور دوسرے دین حق۔ مقدم الذکر کی تبلیغ

پر آپ ﷺ نے خطبۂ حجۃ الوداع کے دوران گواہی لے لی۔ اس کا ذکر گزشتہ نشست میں ہو چکا ہے کہ آپ ؐ نے مجمع سے دریافت فرمایا: اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ ؟ ''لوگو! کیا مَیں نے پہنچا دیا یا نہیں؟'' اور جواب لے لیا: اِنَّا نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ! ''ہاں حضور! ہم گواہ ہیں کہ آپ نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا' حقِ نصیحت ادا کر دیا' حقِ خیر خواہی اور حقِ امانت ادا کر دیا!'' پھر آپ ؐ نے تین مرتبہ فرمایا: ((اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ' اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ' اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ!)) ''اے اللہ! تو بھی گواہ رہ! اے اللہ تو بھی گواہ رہ! اے اللہ تو بھی گواہ رہ!'' اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ)) یعنی اب جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ ان تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ کس قدر جامع کلمہ ہے! لفظ ''غائب'' میں وہ بھی آ گئے جو اُس وقت کرۂ ارضی پر موجود تھے اور وہ تمام انسان بھی آ گئے جو قیامِ قیامت تک پیدا ہونے والے ہیں۔ مطلب یہ کہ اب یہ امانت میرے کاندھے سے اُتری اور تمہارے کاندھے پر آ گئی۔ قرآن مجید میرے پاس امانت تھا' میں نے تم تک پہنچا دیا' اب یہ تمہارے پاس امانت ہے' تم اسے پوری نوعِ انسانی تک پہنچاؤ!

دوسرا پہلو ہے دینِ حق کا غلبہ و اقامت۔ اس اعتبار سے بھی ظاہر بات ہے کہ سارے جزیرہ نمائے عرب پر اللہ کے دین کو غالب کر دینے سے بعثتِ نبویؐ کا مقصد بتمام وکمال پورا نہیں ہوا' بلکہ اسے پورے کرۂ ارضی پر غالب کرنا مقصود ہے۔ اس اعتبار سے اپنے مقصدِ بعثت کے اس بین الاقوامی مرحلے (phase) کا آغاز رسول اللہ ﷺ نے خود بنفسِ نفیس فرما دیا اور اس کی تکمیل دورانِ خلافتِ راشدہ ہوئی۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ خود آنحضور ﷺ نے اس کا آغاز کیسے فرمایا۔

گزشتہ نشست کا تتمّہ

گزشتہ خطاب میں حیاتِ طیبہ کے مدنی دَور کے ضمن میں ایک بات رہ گئی تھی کہ عرب میں جو یہود آباد تھے ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوا۔ غزوۂ بدر' غزوۂ اُحد' غزوۂ

احزاب، صلح حدیبیہ، فتح مکہ اور غزوۂ حنین، یہ مدنی دور کے چھ امتیازی نشانات (land marks) ہیں جن کے بعد جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اللہ کا دین غالب ہو گیا۔ اس ضمن میں مَیں عرض کر چکا ہوں کہ ۹ھ میں حج کے موقع پر سورۃ التوبۃ کی ابتدائی آیات کی صورت میں یہ اعلان فرما دیا گیا کہ مشرکین کے ساتھ اب کوئی معاہدہ نہیں ہے، صرف چار مہینے کی مہلت دی جا رہی ہے، جسے اسلام قبول کرنا ہے وہ کر لے اور جسے اپنے کفر و شرک پر اڑے رہنا ہے وہ جہاں سینگ سمائیں چلا جائے۔ اس کے لیے جزیرہ نمائے عرب میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آیت ۵ میں دوٹوک انداز میں اعلان فرما دیا گیا کہ:

﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ.....﴾

''پس جب یہ محترم مہینے ختم ہو جائیں تو (اے مسلمانو!) قتل کرو ان مشرکوں کو جہاں تم انہیں پاؤ.....''

یہ معاملہ بنی اسماعیل یا اہل عرب کے لیے تھا، جبکہ یہود کے معاملے میں ایک نرمی برتی گئی۔ گزشتہ نشست میں یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ مدینہ منورہ میں تشریف لاتے ہی رسول اللہ ﷺ نے یہود کو معاہدوں کے اندر جکڑ لیا۔ یہ بات آپؐ کے تدبّر اور دُور اندیشی کا شاہکار ہے اور منٹگمری واٹ جیسے مستشرقین نے اس پر آپؐ کو حد درجہ خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ دوسری بات میں نے یہ عرض کی تھی کہ سولہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے جو نماز پڑھی گئی اس میں بھی حکمتِ خداوندی کارفرما تھی۔ یہود یہ سمجھے کہ یہ تو ہمارے ہی پیرو ہیں، ہمارے قبلے کا اتباع کر رہے ہیں، لہٰذا ان کی طرف سے فوری طور پر مخالفت اور اپنی تمام قوتوں کو بروئے کار لا کر نبی اکرم ﷺ کی دعوت کی راہ میں مزاحم ہونے کا معاملہ نہیں ہوا، بلکہ تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو (wait and see) کا سا عمل رہا ہے۔ بہرحال جب غزوۂ بدر ہوا تو دو اعتبارات سے یہود کے کان کھڑے ہوئے۔ ایک تو اس سے متصلاً قبل تحویلِ قبلہ کا معاملہ ہو گیا۔ حکم ہوا: ﴿فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾ (البقرۃ: ۱۴۴) کہ اب اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیر لو! اس پر انہیں احساس ہوا کہ یہ تو بالکل نئی اُمت ہے، جس کی نئی شریعت ہے، نیا قبلہ ہے، نیا مرکز ہے۔ دوسرے بدر کی فتح نے ان کو بھی اب

پوری طرح محسوس کرادیا کہ یہ معاملہ ایسا نہیں ہے جسے نظر انداز کیا جا سکے۔

مدینہ میں یہود کے تین قبیلے آباد تھے: (۱) بنوقینقاع (۲) بنونضیر (۳) بنوقریظہ۔ ان میں سے بنوقینقاع کا پیشہ زرگری تھا۔ وہ سب سے زیادہ امیر بھی تھے اور اتفاقاً سب سے زیادہ بہادر قبیلہ بھی یہی تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے مسلمانوں کے خلاف اقدام کیا۔ غزوۂ بدر کے فوراً بعد اُن کو جوطیش آیا تو ایک یہودی نے ایک مسلمان خاتون کی بے حرمتی کی۔ ایک انصاری صحابیؓ نے جوشِ حمیت میں اس یہودی کو قتل کر دیا۔ یہودیوں نے اس انصاری صحابی کو شہید کر دیا۔ اب معاملہ بڑھا' جس کے نتیجہ میں نبی اکرم ﷺ نے فوراً اقدام فرمایا۔ پندرہ دن کا محاصرہ ہوا اور اس کے بعد بنوقینقاع کو وہاں سے جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ یہود کا پہلا قبیلہ تھا جسے جنگ بدر کے فوراً بعد مدینہ منورہ سے نکال دیا گیا۔

غزوۂ اُحد کے متعلق میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کے بعد صورتِ حال بڑی مخدوش ہوگئی تھی۔ دشمنوں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے کہ مسلمانوں سے ایسی ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے' یہ بھی انسان ہی ہیں۔ اگر بدر میں ستر مشرک مارے گئے تھے تو اُحد میں ستر مسلمان بھی شہید ہو گئے۔ اُن کے حوصلے جو بڑھے تو بنونضیر نے ایک نئی حرکت کی' اور وہ تھی نبی علیہ السلام کو قتل کرنے کی سازش۔ اُن کی یہی حرکت اُن کی جلاوطنی کی تمہید بن گئی۔

تیسرا قبیلہ رہ گیا بنوقریظہ کا' اُن کے ساتھ نبی اکرم ﷺ نے بڑی نرمی برتی۔ انصار کے ساتھ ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے' خصوصاً حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اُن کے گہرے مراسم تھے۔ لیکن غزوۂ خندق کے موقع پر انہوں نے بدعہدی کی۔ وہ تو یوں کہیے کہ حکمتِ خداوندی یا مشیتِ الٰہی کا فیصلہ کچھ اور تھا' ورنہ صورتحال بڑی خطرناک بن چکی تھی۔ بارہ ہزار کا لشکر سامنے تھا اور بنوقریظہ نے صاف کہہ دیا کہ ہمارے اور محمد (ﷺ) کے درمیان کوئی عہد نہیں۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو اُن کے حلیف اور ان سے قریبی تعلق رکھنے والے تھے' وہی آنحضور ﷺ کے حکم سے مذاکرات کے لیے گئے تھے۔ ان سے آپؐ نے فرمادیا تھا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو تو واپس آ کر مجمع عام

میں نہ کہنا' ایسا نہ ہو مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اشارے کنائے میں بتا دیا کہ یہود نے بدعہدی کی ہے۔ لہٰذا غزوۂ احزاب کے بعد غزوۂ بنو قریظہ ہوا اور اس قبیلے کو تورات کے احکام کے مطابق اُن کی بدعہدی کی سزا دی گئی۔ چنانچہ ان کے جتنے قابلِ جنگ مرد تھے' ان کو قتل کر دیا گیا اور باقی کو جلاوطن کر دیا گیا۔ اس طرح مدینہ منورہ سے یہودیوں کا استیصال ہو گیا۔

اس کے بعد ان کا مرکز خیبر بنا' جو پہلے سے بھی یہود کا بہت بڑا گڑھ تھا۔ یہ تینوں قبیلے جو وہاں پہنچے تو اُن کی ایک جمعیت بن گئی اور وہ اس مرکز سے مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیاں کرنے لگے۔ ان ریشہ دوانیوں کو ختم کرنے اور یہود کی طاقت کو توڑنے کے لیے ۶ ھ کے اواخر میں رسول اللہ ﷺ نے خیبر پر حملہ کیا اور ان کا یہ مرکز ختم کر دیا۔ اس طرح اندرونِ ملک' جزیرہ نمائے عرب کی حد تک ایک طرف مشرکین کے استیصال سے شرک کی مکمل بیخ کنی ہو گئی اور دوسری طرف یہودیوں کی طاقت بھی ختم ہو گئی۔ البتہ ازروئے: ﴿حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ﴾ (التوبۃ) ان کے ساتھ رعایت یہ برتی گئی کہ اگر یہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں تو ان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

یہ بات ذرا سمجھنے کی ہے کہ یہ رعایت اہلِ عرب کو نہیں دی گئی۔ ان کے لیے دو ہی متبادل (alternatives) تھے' یا اسلام قبول کرو یا قتل کر دیے جاؤ گے۔ تیسرا اختیار یہ تھا کہ ملک چھوڑ کر چلے جاؤ تو چلے جاؤ' ملک عرب میں رہ نہیں سکتے۔ لیکن یہود کو یہ رعایت دی گئی کہ اسلام کو قبول کر لیں تو ہمارے بھائی اور برابر کے حق دار ہوں گے۔ اگر یہ قبول نہیں ہے تو وہ چھوٹے بن کر رہیں اور جزیہ دیں۔ اس طرح وہ ذمی کی حیثیت سے اسلامی مملکت میں رہ سکتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ گزشتہ نشستوں میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ جس قوم کی طرف کسی رسول کی براہِ راست بعثت ہوتی ہے' جس میں وہ رسول ہوتا ہے' جس کی زبان بولتا ہوا وہ آتا ہے' وہ قوم اگر رسول کی دعوت رد کر دے تو اُس قوم کو پھر کوئی رعایت نہیں دی جاتی۔ دوسری قوم کے لیے اس بنیاد پر کوئی رعایت ہو

سکتی ہے کہ اس کے اور اُن کے درمیان کوئی حجاب ہوسکتا ہے۔ چونکہ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت بالخصوص اہلِ عرب کی طرف تھی' بمطابق آیتِ قرآنی: ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ (الجمعۃ:۲) آپؐ انہی میں سے تھے' لہٰذا اہلِ عرب پر تو اتمامِ حجت بتمام وکمال ہوگیا۔ اُن کے لیے اب کوئی رعایت نہیں' اُن کو دوٹوک فیصلہ کرنا ہوگا' یا اسلام قبول کریں یا ملک چھوڑ کر چلے جائیں' ورنہ ان کو قتل کر دیا جائے گا۔ البتہ یہود کے ساتھ جو رعایت برتی گئی اس پر قیاس کرتے ہوئے بعد میں دنیا کی جتنی اقوام ہیں اُن کے ساتھ معاملہ اسی قاعدے کے تحت ہوگا۔ چنانچہ تاریخِ اسلام کی یہ ایک بڑی نمایاں بات ہے کہ خلافتِ راشدہ کے دوران جب مسلمان غلبۂ دین کی خاطر جہاد وقتال کے لیے نکلے تو ان کی طرف سے ہمیشہ تین باتیں پیش کی گئیں:

(۱) اسلام لے آؤ تو تم ہمارے بھائی ہو' تمہارے جان و مال اتنے ہی محترم ہوں گے جتنے کسی مسلمان کے ہیں۔

(۲) اگر اسلام نہیں لاتے تو جزیہ دو اور چھوٹے بن کر رہو۔ اس لیے کہ فاسد اور ظالمانہ نظام انسان کو اپنے اندر جکڑ لیتا ہے اور وہ اللہ اور بندے کے درمیان حجاب اور پردہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا اس غلط نظام کو ختم (shatter) کر دیا جائے گا۔ کسی فرد کو کبھی مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ اپنا مذہب ترک کرے اور اسلام قبول کرے' اس کو پوری مذہبی آزادی ہے' لیکن نظامِ اجتماعی اللہ کے دین کے سوا گوارا نہیں کیا جاسکتا' اس لیے کہ یہ بات فیصلۂ الٰہی ﴿لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ کے خلاف ہوجائے گی!

(۳) اور اگر یہ دونوں باتیں منظور نہیں ہیں تو تلوار ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی!

دعوتِ محمدیؐ کے بین الاقوامی مرحلے کا آغاز

اب آگے چلیے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی دعوت کے بین الاقوامی مرحلے کا آغاز کس طرح کیا۔ حکمت تبلیغ کے اعتبار سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیے' اور یہ بہت اہم بات ہے' کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے جیسے ہی مکہ مکرمہ میں اپنی دعوت کا آغاز فرمایا

اسی وقت آپ قیصر و کسریٰ، مقوقس، نجاشی اور دیگر حکمرانوں کو خطوط بھی لکھ سکتے تھے، یہ آپؐ کے لیے ناممکن نہ تھا۔ لیکن یہاں تدریج دیکھیے کہ جب تک جزیرہ نمائے عرب میں آپ نے اپنے قدم مضبوطی سے جما نہیں لیے اور صلح حدیبیہ ہو نہیں گئی، آپؐ نے اس کام کا آغاز نہیں فرمایا۔ صلح حدیبیہ درحقیقت اس بات کی علامت ہے کہ اب قریش نے محمد رسول اللہ ﷺ کو تسلیم کر لیا، چاہے آپؐ نے بظاہر دب کر صلح کی۔ اس اعتبار سے اسے قرآن حکیم میں بھی ''فتح مبین'' قرار دیا گیا۔ یہ موقع تھا کہ اندرونِ ملک آپ ﷺ کے مشن کی تکمیل کا مرحلہ قریب آ گیا، چنانچہ اب آپؐ نے سلاطین و ملوک کے نام خطوط کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ ہے حکمتِ تبلیغ محمد رسول اللہ ﷺ کی۔ تیرہ برس تک آنحضور ﷺ نے اپنی تمام تر توجہ مکہ مکرمہ کی سرزمین پر مرکوز رکھی اور ۱۰ نبوی میں آپ ﷺ نے طائف کا سفر کیا۔ گویا جب تک اہل مکہ نے آپؐ کو قتل کرنے کا فیصلہ نہ کر لیا تھا اُس وقت تک آپؐ نے مکہ سے قدم بھی باہر نہیں رکھا۔ اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ میں تمکّن عطا فرمایا تو پورے چھ برس مدینہ میں جدوجہد ہوتی رہی اور جب صلح حدیبیہ کے بعد آپؐ کی طاقت کو تسلیم کر لیا گیا تو اب آپؐ نے مختلف بادشاہوں اور رؤساء کو دعوتی خطوط ارسال فرمائے۔ آپؐ کے نامہ ہائے مبارک قیصر روم، کسریٰ (عظیم فارس)، مقوقس (شاہِ مصر)، نجاشی (شاہِ حبش)، رؤسائے یمن، حارث غسانی (رئیسِ شام) اور آس پاس کے تمام حکمرانوں اور سلاطین کی طرف گئے ہیں۔

ایران میں اُس وقت خسرو پرویز تختِ حکومت پر متمکّن تھا اور اپنے پیشرو شہنشاہوں کی طرح ''کسریٰ'' کے لقب سے ملقب تھا۔ اس کی بدبختی کہ حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ جب اُس کے دربار میں خط لے کر گئے تو وہ نہایت برہم ہوا اور نامۂ مبارک کو چاک کر دیا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھیے کہ کسریٰ عربوں کو اپنی رعیت سمجھتا تھا۔ عربوں کی اُس وقت کوئی حیثیت بھی نہیں تھی۔ اُس وقت روئے ارضی پر دو عظیم طاقتیں (سپر پاورز) تھیں، ایک سلطنتِ روما اور دوسری سلطنتِ فارس۔ عرب کے تمام زرخیز علاقے ان کے پاس تھے۔ عراقِ عرب جو بہت زرخیز ہے، اس پر ایرانیوں کا تسلط تھا اور

شامِ عرب پر رومیوں کا قبضہ تھا۔ باقی درمیان میں ''الربع الخالی'' رہ گیا۔ وہ یا تو لق ودق صحرا ہے یا حجاز کا پہاڑی علاقہ۔ یمن جو زرخیز علاقہ تھا' اس پر بھی ایران کا قبضہ تھا اور عرب کی حیثیت صرف آزاد قبائل کی سی تھی کہ حکومتیں ان کے ساتھ زیادہ تعرض نہیں کیا کرتیں' البتہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ قبائل ہمارے زیر اثر ہیں۔ چنانچہ کسریٰ کے ذہن میں بھی یہی تھا کہ عرب تو میری رعیت ہیں۔ اس نے کہا کہ ایک عرب کی یہ گستاخی کہ مجھے خط لکھا اور میرے نام سے پہلے اپنا نام لکھا؟ عجم کا طریقہ یہ تھا کہ سلاطین کو جو خط لکھے جاتے تھے ان میں بادشاہ کا نام پہلے ہوتا تھا اور مکتوب نگار کا بعد میں ـــــ جبکہ رسول اللہ ﷺ کے نامۂ مبارک میں بسم اللہ کے بعد پہلے آنحضور ﷺ کا نام تھا اور بعد میں شاہِ کسریٰ کا (مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِلٰى كِسْرٰى عَظِيْمِ فارس) ـــــ اس پر وہ اس قدر طیش میں آیا کہ خط پھاڑ دیا[1] اور یمن کے حاکم بازان کے نام ایک حکم بھیجا کہ اس شخص کو فوراً گرفتار کر کے ہمارے ہاں پیش کرو۔ بازان نے دو آدمی روانہ کیے جو آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور کہا کہ بادشاہوں کے بادشاہ نے آپ کو طلب کیا ہے۔ آپ ﷺ نے ان ایلچیوں کو رات ٹھہرایا اور صبح خبر دے دی کہ تمہارا بادشاہ رات کو اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔ اب تم واپس جاؤ اور اپنے گورنر سے کہہ دینا کہ جلد ہی اسلام کی حکومت کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچے گی۔

قیصرِ روم کے نام رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک لے کر حضرت دِحیہ کلبی رضی اللہ عنہ گئے تھے۔ یہ وہ صحابی ہیں جو انتہائی خوبرو اور خوش شکل تھے' اور اُن کا ذکر خاص طور پر اس پہلو سے آتا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ رسول اللہ ﷺ کے پاس انسانی شکل میں آتے تھے تو حضرت دِحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں آتے تھے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ اُس وقت یہ جو دو عظیم سلطنتیں تھیں ان کا معاملہ یہ تھا کہ کبھی سلطنتِ روما کا پلڑا بھاری ہوتا تھا اور کسریٰ کو پسپائی اختیار کرنا پڑتی تھی' جبکہ کبھی ایرانی آگے بڑھتے تھے اور رومی پیچھے ہٹ جاتے

(۱) واضح رہے کہ اُس وقت کسریٰ کے سامنے رسول اللہ ﷺ کے نامۂ مبارک کا ترجمہ تھا جسے اُس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور آپ ﷺ کا اصل نامۂ مبارک محفوظ رہا اور آج بھی محفوظ ہے۔ (مرتب)

تھے۔صورت واقعہ یہ تھی کہ رومی تو عیسائی (اہلِ کتاب) تھے اور ایرانی آتش پرست۔ اور مکی دور میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ مسلمانوں کی ہمدردیاں رومیوں یعنی نصاریٰ کے ساتھ ہیں اور ایرانی مشرکینِ مکّہ سے قریب تر ہیں۔ ہوا یہ کہ اُس زمانہ میں ہرقل قیصرِ روم کو ایرانیوں کے ہاتھوں ایک بڑی شرمناک شکست ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرکوں نے گھی کے چراغ جلائے اور بغلیں بجائیں کہ دیکھو مسلمانو! اہلِ کتاب پسپا ہو گئے۔ اس پر مسلمانوں کے دل بجھ گئے۔ سورۃ الروم کی ابتدائی آیات اسی موضوع پر ہیں:

﴿الٓمّٓ ① غُلِبَتِ الرُّوْمُ ② فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ③ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ؕ﴾ (آیات ۱تا۴)

''ا ل م۔ رومی مغلوب ہو گئے۔ قریب کی سرزمین میں۔ اور وہ اپنی مغلوبیت کے بعد جلد ہی غالب ہوں گے۔ چند سالوں میں۔''

ان آیات میں یہ خوشخبری سنا دی گئی کہ وہ مغلوب ہونے کے بعد پھر غالب ہو جائیں گے اور یہ صرف چند سالوں میں ہو گا۔ یہ ایک پیشین گوئی تھی جو سچ ثابت ہوئی اور ٹھیک نو سال بعد یہ واقعہ ہوا کہ اِدھر مسلمانوں کو معرکۂ بدر میں فتح ہوئی اور اُدھر قیصرِ روم کو کسریٰ کے مقابلے میں فتح ہوئی۔ چنانچہ اہلِ ایمان کے لیے یہ دوطرفہ خوشی تھی۔ تو اس پس منظر کو ذہن میں رکھئے۔

حضرت دِحیہ کلبی رضی اللہ عنہ قیصرِ روم کے نام رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک لے کر چلے تھے۔ جب آپ دِمشق کے قریب پہنچے تو ان کو پتا چلا کہ ہرقل ان دنوں یروشلم میں ہے۔ وہ پاپیادہ چل کر شکرانہ ادا کرنے کے لیے بیت المقدس آیا تھا۔ رئیسِ شام حارث غسانی نے حضرت دِحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو ہرقل کے پاس بیت المقدس بھیج دیا اور آپؓ نے آنحضور ﷺ کا نامۂ مبارک اسے پہنچا دیا۔ قیصرِ روم ہرقل خود تورات و انجیل کا عالم تھا' لہٰذا خط پڑھتے ہی جان گیا کہ یہ وہی آخری رسول ہیں جن کی بعثت کی ہمارے ہاں پیشین گوئیاں ہیں۔ اس کو بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی' لیکن اس نے کوشش یہ کی کہ جس طرح کبھی رومۃ الکبریٰ کے شہنشاہ قسطنطین (Constantine) اور اس کی پوری رعایا

نے مجموعی طور پر (en bloc) عیسائیت قبول کر لی تھی اسی طرح اب پوری سلطنتِ روما اسلام قبول کر لے اور میرا اقتدار برقرار رہے۔ اس نے اپنے سرکردہ لوگوں سے یہ معلوم کروایا کہ ان دنوں عربوں کا کوئی تجارتی قافلہ تو نہیں آیا ہوا؟ اُس زمانے میں ابوسفیان (جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) ایک تجارتی قافلے کے ساتھ وہاں ٹھہرے ہوئے تھے' ان کو طلب کیا گیا اور پوری شان و شوکت کے ساتھ دربار منعقد ہوا۔ قیصر نے اپنے تمام نائبین سلطنت بھی بلا لیے' بطارقہ' قسّیسین اور احبار و رہبان کو بھی حسبِ مراتب بٹھایا گیا اور ابوسفیان کو ان کے ہمراہیوں سمیت بلایا گیا۔ پہلے تو دربار میں نبی اکرم ﷺ کا نامۂ مبارک پڑھ کر سنایا گیا۔ اس کے بعد قیصر نے ابوسفیان سے اس انداز میں سوالات کیے کہ حاضرین کے لیے حق کو پہچان لینا بالکل آسان ہو جائے۔ گویا اُس نے بھرے دربار میں چاہا کہ حق واضح ہو جائے۔ اس نے آنحضور ﷺ کے بارے میں سوالات کیے کہ یہ کون صاحب ہیں؟ ان کا خاندان کیسا ہے؟ ان کے خاندان میں کسی اور نے بھی کبھی نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟ ان تمام باتوں کا جواب ابوسفیان نے دیا۔ ان کا ایک قول ملتا ہے' جو ایمان لانے کے بعد کا ہے' کہ اس مکالمے کے دوران کئی بار میرا جی چاہا کہ جھوٹ بول دوں۔ اس لیے کہ ہرقل کی جرح ایک بڑے ماہر کی جرح تھی' اور وہ ہر وہ بات اگلوا رہا تھا جس سے ثابت ہو جائے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ ابوسفیان کہتے ہیں میں نے سوچا کہ میرے ساتھی کیا کہیں گے کہ قریش کا اتنا بڑا سردار جھوٹ بول رہا ہے' لہٰذا میں جھوٹ نہ بول سکا۔ ہرقل نے یہ سوال بھی کیا کہ کہیں اُن کے خاندان میں بادشاہت تو نہیں رہی کہ اس کھوئی ہوئی بادشاہت کو حاصل کرنے کے لیے (معاذ اللہ!) یہ مذہبی سٹنٹ کھڑا کیا ہو؟ آنحضور ﷺ کے اخلاق و کردار کے متعلق جب اس نے سوال کیا تو ابوسفیان نے جواب دیا کہ انہوں نے آج تک کوئی جھوٹ نہیں بولا' کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی نہیں کی۔ ایک سوال اس نے یہ بھی کیا کہ اس کے پیروکاروں میں اکثریت غرباء کی ہے یا امراء کی؟ جواب ملا غرباء کی! پھر پوچھا: جو شخص اُن پر ایمان لے آتا ہے کبھی واپس بھی پھرتا ہے؟ جواب ملا آج تک کوئی واپس نہیں پھرا۔ قیصر نے

آپ ﷺ کی تعلیمات کے بارے میں دریافت کیا تو ابوسفیان نے کہا: ''وہ کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو' کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ' نماز پڑھو' پاک دامنی اختیار کرو' سچ بولو' صلہ رحمی کرو''۔

علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں کہ اس مکالمہ کے بعد قیصر نے مترجم کے ذریعہ سے یہ تبصرہ کیا:

''تم نے اس کو شریف النسب بتایا' پیغمبر اچھے خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ تم نے کہا کہ اس کے خاندان سے کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا' اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس کے خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا' اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے۔ تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا' جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے! تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے اس کی پیروی کی ہے (تو) پیغمبر کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب لوگ ہی ہوتے ہیں۔ تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے' سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں کیا' پیغمبر کبھی فریب نہیں کرتے۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز اور تقویٰ وعفاف کی ہدایت کرتا ہے' اگر یہ سچ ہے تو میری قدم گاہ تک اس کا قبضہ ہو جائے گا۔ مجھے یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے' لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ اگر میں وہاں جا سکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا۔''

یہ ہے ہرقل قیصرِ روم کا تبصرہ جو کتب سیر میں محفوظ ہے۔

جب اہلِ دربار پر یہ بات واضح ہوگئی کہ ہرقل کا جھکاؤ اسلام کی جانب ہے اور وہ مسلمان ہوا چاہتا ہے' تو اب دربار میں شور برپا ہوگیا۔ عمائدینِ سلطنت اور اَحبار و رُہبان کے نتھنے غیظ وغضب کے باعث پھولنے لگے اور ان کی آنکھیں برہمی وغصہ سے انگارے اُگلنے لگیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر ہرقل کو اپنے اقتدار کا خطرہ محسوس ہوا اور یہ چیز اس کے پاؤں کی بیڑی بن گئی۔ اُس کو اپنی حکومت زیادہ عزیز تھی۔ چنانچہ اس نے عربوں کو دربار سے اٹھا دیا اور رسول اللہ ﷺ کے سفیر حضرت دِحیہ کلبیؓ کو کسی جواب کے

بغیر واپس جانے کا حکم سنا دیا۔ اس نے اپنے عمائدینِ سلطنت اور پادریوں سے کہا کہ مَیں تو تمہارے ایمان کی آزمائش کے لیے یہ مکالمہ کر رہا تھا کہ تم لوگوں میں ایمان موجود ہے بھی یا نہیں! اس طرح ہرقل محروم رہ گیا اور ایمان نہ لا سکا۔

مقوقس شاہِ مصر کی طرف حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ گئے۔ وہ بھی عیسائی تھا اور اس نے بھی نبی آخر الزمان ﷺ کو پہچان لیا۔ اگرچہ ایمان وہ بھی نہیں لایا' لیکن اس نے حضرت حاطبؓ کے ساتھ بڑے اکرام و تعظیم کا معاملہ کیا اور آنحضور ﷺ کی خدمت میں دو لڑکیاں بطورِ تحفہ ارسال کیں۔ یہ حضرت ماریہ قبطیہ اور حضرت شیریں رضی اللہ عنہا تھیں۔ دونوں ایمان لے آئیں۔ حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے حضرت ابراہیم تولّد ہوئے۔ نبی اکرم ﷺ کا گھوڑا دُلدُل بھی مقوقس ہی کا بھیجا ہوا تھا۔

حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو آپ ﷺ نے دعوتِ اسلام کا جو مکتوب ارسال فرمایا اس کے جواب میں اُس نے عریضہ بھیجا کہ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں''۔ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ جو ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تھے' یہیں موجود تھے' نجاشی نے ان کے ہاتھ پر بیعت اسلام کر لی۔

غزوۂ مُوتہ

شرحبیل بن عمرو جو رؤسائے شام میں سے تھا' اس کے پاس آنحضور ﷺ کے ایلچی حضرت حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ گئے۔ اُس نے طیش میں آ کر ان کو شہید کر دیا۔ سفیر کا قتل ہمیشہ سے ایک بہت بڑا جرم ہے اور اسے اقدام جنگ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ بات سلطنتِ روما سے مسلّح تصادم کی تمہید بن گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے تین ہزار کا لشکر تیار کیا' حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اس کا علَم دیا اور فرمایا کہ اگر یہ شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ علَم سنبھال لیں' اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ انصاری رضی اللہ عنہ علَم سنبھال لیں۔ اگرچہ لشکر میں بڑے بڑے صحابہؓ موجود تھے' لیکن آنحضور ﷺ نے سپہ سالار بنایا حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو' تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسلام یہ ساری اونچ نیچ ختم کر چکا ہے' قریش کی قرشیت اور ایک آزاد کردہ غلام کے مابین اسلام میں کوئی فرق نہیں

ہے۔ اس تین ہزار کے لشکر کے سامنے شرحبیل بن عمرو ایک لاکھ کی تیار فوج لے کر آ گیا۔ دُنیوی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ گویا ایسے ہی ہے جیسے پاکستان کی امریکہ سے جنگ چھڑ جائے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ ایک لاکھ کا لشکر آ رہا ہے تو انہوں نے مجلس شوریٰ منعقد کی کہ اب کیا کیا جائے؟ اس مشاورت میں حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے خطاب فرمایا کہ ہم دنیا کے طالب ہو کر نہیں نکلے، فتح اور شکست سے ہمارا کوئی تعلق نہیں، ہمارا مقصد تو شہادت ہے اور اس سے بلند اور مقصد کیا ہوگا؟ اس خطاب کا یہ اثر ہوا کہ جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ چنانچہ جوشِ ایمانی اور شوقِ شہادت سے سرشار یہ مختصر سا لشکر ایک لاکھ کی فوج سے ٹکرا گیا۔ امیر لشکر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے علم سنبھال لیا۔ جنگ کے دوران ان کے جسم پر نوے زخم آئے اور ان میں سے کوئی پیٹھ پر نہ تھا۔ ایک ہاتھ کٹ گیا تو دوسرے میں عَلَم سنبھال لیا۔ جب دوسرا بھی کٹ گیا تو دونوں کٹے ہوئے ہاتھوں سے عَلَم اپنے سینے سے لگا لیا تا کہ عَلَم ان کے جیتے جی زمین بوس نہ ہو۔ یہ صورت حال دیکھ کر عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر عَلَم اپنے ہاتھ میں لیا۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ زخموں سے چور چور ہو کر زمین پر گر پڑے اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے دونوں بازوؤں کے عوض جنت میں دو پر عطا فرما دیے جن کے ذریعے وہ جہاں چاہتے ہیں اڑتے ہیں۔ اسی لیے ان کا لقب جعفر طیار اور جعفر ذوالجناحین پڑ گیا۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بھی بے جگری سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

اس کے بعد صحابہؓ نے سیفٌ من سیوفِ اللہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار منتخب کیا۔ انہوں نے عَلَم سنبھالتے ہی نہایت پرزور جنگ کی۔ اُن کا اپنا بیان ہے کہ جنگ موتہ کے روز میرے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹ گئیں، پھر بس ایک چھوٹی سی یمنی تلوار باقی بچی۔ اس نازک صورت حال میں حضرت خالدؓ ایک ایسی جنگی چال کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جس کے ذریعے رومیوں کو مرعوب کر کے اتنی کامیابی کے ساتھ مسلمانوں کو پیچھے

ہٹالیا جائے کہ رومیوں کو تعاقب کی ہمت نہ ہو' جس میں وہ کامیاب رہے اور بڑی حکمت عملی سے لشکر کو بچا کر واپس لے آئے۔ یہاں مسلمانوں کا یہ عالم تھا کہ عورتیں باہر نکل آئیں اور خاک ڈالی گئی کہ تم اللہ کے راستے میں پیٹھ دکھا کر واپس آئے ہو۔ لیکن نبی اکرم ﷺ کو جب یہ خبر ملی تو آپ بنفسِ نفیس مدینہ سے باہر تشریف لائے' بڑے تپاک سے فوج کا استقبال فرمایا اور یہ ارشاد فرما کر ان کو تسلی دی کہ تم مفرور نہیں ہو' بلکہ دوبارہ حملہ کرنے کی نیت سے پیچھے ہٹ آنے والے ہو۔ جیسا کہ سورۃ الانفال (آیت ۱۶) میں الفاظ آئے ہیں۔ چنانچہ اگر حکمت عملی کی وجہ سے پیچھے ہٹنا پڑے تو یہ جائز ہے بشرطیکہ جان بچانا مقصود نہ ہو۔

غزوۂ تبوک

غزوۂ موتہ کے بعد اب سلطنتِ روما کے ساتھ ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ اس معرکے نے غسانیوں اور رومیوں کو ہلا کر رکھ دیا اور ان کو خوف لاحق ہو گیا کہ مسلمان چین سے بیٹھنے والے نہیں ہیں' وہ یقیناً دوبارہ حملہ کریں گے۔ چنانچہ ایک طرف غسانیوں نے جنگی تیاریاں شروع کر دیں' دوسری طرف ہرقل نے بھی اپنی چالیس ہزار فوج شام بھیج دی اور خود ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ حمص پہنچ گیا۔ ادھر نبی اکرم ﷺ نے بھی فوج کی تیاری کا حکم دے دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ آپ ﷺ کی طرف سے نفیر عام ہوئی کہ ہر وہ مسلمان جو جنگ کے قابل ہے' نکل کھڑا ہو۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ ہر ایک کے لیے نکلنا لازم ہو۔ ترغیب وتشویق ہوتی تھی کہ اللہ کی راہ میں نکلو اور نبی اکرم ﷺ درپیش مہم کے لیے مطلوبہ تعداد کے مطابق خود انتخاب فرما لیتے تھے۔ لیکن اس مہم کے لیے حکم ہوا:

﴿انْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾

(التوبۃ: ۴۱)

''نکلو خواہ ہلکے ہو یا بھاری اور جہاد کرو اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔''

سورۃ التوبہ میں غزوۂ تبوک کے حالات و واقعات پر مفصل تبصرہ موجود ہے۔ اس

ضمن میں یہ بھی فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ۭ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـــًٔا ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ (التوبۃ)

''اے اہلِ ایمان! تمہیں کیا ہوا ہے کہ جب تمہیں کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو زمین کا بوجھ بن جاتے ہو؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دُنیوی زندگی کو پسند کر لیا ہے؟ پس آخرت کے مقابلے میں تو دُنیوی زندگی معمولی متاع سے زیادہ نہیں۔ اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب سے دوچار کرے گا اور تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اب آپ اندازہ کر لیں کہ امتحان کس قدر کٹھن تھا! مدنی دور میں مسلمانوں کے لیے ایک تو غزوۂ احزاب اور دوسرے غزوۂ تبوک عظیم ترین آزمائش کے مراحل تھے۔ ۹ھ میں جب غزوۂ تبوک کے لیے نفیرِ عام ہوئی تو سخت گرمی کا موسم تھا اور قحط کا عالم تھا۔ کھجور کی فصل تیار تھی۔ نکل جاتے ہیں تو فصل اٹھانے والا کوئی نہیں ہوگا اور فصل تباہ ہو جائے گی' لگ بھگ سات سو میل کا سفر طے کرنا ہے' ہر ایک کے پاس سواری بھی موجود نہیں ہے — اور پھر یہ ٹکراؤ ہے سلطنتِ روما کے ساتھ۔ اب تک تو معاملہ ایک اور تین کا تھا۔ غزوۂ بدر اور غزوۂ اُحد میں یہی تناسب تھا۔ غزوۂ خندق میں ایک اور دس کا تھا' لیکن یہاں تو کوئی نسبت ہی نہیں۔ مقابلہ سلطنتِ روما سے ہے۔ ان کے پاس لاکھوں کی تربیت یافتہ فوج ہے اور یہاں دُنیوی اعتبار سے اس کا عُشرِ عشیر بھی نہیں۔ یہ وہ وقت تھا کہ اہلِ ایمان کے ایمان کی پوری آزمائش ہو گئی اور منافقین کا پردہ چاک ہو گیا' جو خود بھی جنگ کے لیے نکلنے سے جی چراتے تھے اور دوسروں کو بھی اس سے منع کرتے تھے۔ وہ اہلِ ایمان سے بڑے ہی ناصحانہ انداز میں کہتے تھے: ﴿لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ﴾ ''اس

سخت گرمی میں نہ نکلو!'' اُن کے مقابلے میں مسلمانوں سے جواب دلوایا گیا کہ: ﴿قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا﴾ (التوبۃ: ۸۱) ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ جہنم کی آگ اس سے کہیں زیادہ گرم ہے''۔ اب خود دیکھ لو' یا یہ گرمی برداشت کر لو یا وہ (جہنم کی)۔ بعض لوگوں نے اس طرح کے فقرے چست کیے جو غزوۂ بدر کے موقع پر بھی کہے گئے تھے: ﴿غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ﴾ (الانفال: ۴۹) ''ان کے دین نے ان کو دھوکے میں ڈال دیا ہے''۔ ان لوگوں کی تو مت ماری گئی ہے' یہ لوگ موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ جواب دلوایا گیا:

﴿قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۚ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ﴾ (التوبۃ)

''کہو تم ہمارے متعلق دو بھلائیوں میں سے کسی ایک ہی کے منتظر ہو سکتے ہو' جبکہ ہم تمہارے متعلق اس امر کے منتظر ہیں کہ اللہ تعالیٰ یا تمہیں اپنے کسی عذاب میں مبتلا کرے یا ہمارے ہاتھوں سزا دے' پس تم انتظار کرو' ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں''۔

گویا ہماری تو کامیابی ہی کامیابی ہے۔ اگر ہم سب شہید ہو جائیں تو بہت بڑی کامیابی ہے اور اگر کامیاب ہو کر لوٹ آئے تو تم بھی مانو گے کہ کامیاب ہیں۔ ہمارے لیے تو ناکامی کا کوئی سوال ہی نہیں!

بہرحال نبی اکرم ﷺ تیس ہزار کا لشکر لے کر نکلے۔ منزل پر منزل طے کرتے ہوئے شام اور عرب کی سرحد (تبوک) تک پہنچ گئے۔ ہرقل پانچ چھ لاکھ کی فوج کے ساتھ موجود تھا' لیکن مقابلے میں نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پہچان چکا تھا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔

غزوۂ مُوتہ میں بھی وہ پیچھے ہی رہا تھا اور خود دیکھتا رہا کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے' اور اب تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بنفسِ نفیس آ گئے تھے۔ چنانچہ وہ طرح دے گیا اور اس نے

سرحد سے تمام فوجیں واپس ہٹا کر مسلح تصادم کا ہر امکان روک دیا۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی اس سے زائد اقدام نہیں فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ تبوک میں بیس دن تک مقیم رہے تاکہ قیصر روم اگر مقابلے میں آنا چاہے تو آئے۔ اس طرح لشکر اسلام کو زبردست اخلاقی اور نفسیاتی فتح حاصل ہوئی۔ اس دوران آس پاس کے رؤساء آتے رہے' کسی نے اسلام قبول کر لیا اور کسی نے اطاعت قبول کر لی۔ اس طرح آنحضور ﷺ پورے علاقے پر اپنی دھاک قائم کر کے واپس تشریف لے آئے۔

اس کے بعد جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا ہے تو سلطنتِ روما سے ٹکراؤ کے لیے جیش اسامہؓ تیار تھا۔ گویا سلطنتِ روما کے ساتھ تصادم کا آغاز خلافتِ راشدہ میں نہیں ہوا' اس پورے عمل کا آغاز محمد رسول اللہ ﷺ نے بنفسِ نفیس فرمایا ہے۔ جیشِ اسامہ صرف اس وجہ سے رکا رہا کہ نبی اکرم ﷺ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ یہ ہے دراصل اس عمل کا نقطۂ آغاز جو بعد میں دورانِ خلافت راشدہ اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا۔

خلافتِ صدیقی میں انقلابِ نبویؐ کا استحکام

اس بات کو ذہن میں رکھیے کہ خلافت راشدہ درحقیقت خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہے۔ میں اِن شاء اللہ آئندہ اس کے بعض انتہائی اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالوں گا۔ اسلامی تاریخ کے بارے میں جو مغالطے ان لوگوں کے دلوں میں بھی بیٹھے ہوئے ہیں جو اپنے آپ کو اہل سنت کہتے ہیں' ان کا ازالہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت خلافتِ راشدہ سے بدظنی پیدا کی گئی ہے۔ چنانچہ بعض نوجوان یہ کہتے ہوئے ملیں گے کہ خلافتِ راشدہ میں کیا رکھا تھا' سارا زمانہ باہمی خانہ جنگی کی نذر ہو گیا! یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اگر خلافتِ راشدہ کی نفی ہو جائے تو نبی اکرم ﷺ کے پورے کارنامے کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ اصل حجت تو یہ ہے کہ ایک اجتماعی نظام کو چلا کر دکھا دیا جائے' اور یہ تقاضا اگر بتمام و کمال پورا ہوا ہے تو وہ

دورانِ خلافت راشدہ پورا ہوا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی اپنی حیاتِ طیبہ میں تو انقلاب کی تکمیل ہوئی تھی' ابھی اس کی برکات کا ظہور پورے طور پر نہیں ہوا تھا۔

کسی بھی انقلاب کے بعد اس کو مستحکم (consolidate) کیا جاتا ہے' اس کے بعد اس کی برکات کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی مشیت تھی اور سب سے بڑھ کر نبی اکرم ﷺ کا اختیار (choice) تھا' کہ آپؐ نے اس دنیا میں مزید قیام کرنا گوارا نہ کیا' ورنہ ہمارا تو جی چاہتا ہے کہ آنحضور ﷺ اپنے انقلاب کی تکمیل کے بعد کچھ اور عرصہ اس دنیا میں مقیم رہتے' تاکہ جو لوگ ایک کثیر تعداد میں ایمان لائے تھے اور جن کے بارے میں قرآن مجید میں آیا ہے: ﴿وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ۙ﴿۲﴾﴾ (النصر) ان لوگوں کی بذاتِ خود تربیت فرماتے۔ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنے مشن کی تکمیل کے بعد ہر وہ لمحہ جو اس دنیا میں بیت رہا تھا وہ آپؐ پر انتہائی شاق تھا۔ بس جوں ہی فرضِ منصبی کی تکمیل ہوئی' لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ کا فریضہ مکمل ہوا' ادھر اللہ کی طرف سے اس کی شہادت بھی آ گئی کہ: ﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ﴾ (المائدۃ:۳) اور ادھر آنحضور ﷺ نے لوگوں سے بھی شہادت لے لی کہ: ''اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ'' اور آنحضور ﷺ نے ((اَللّٰهُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی)) کہہ کر اس دنیا سے رخصت کی درخواست کر دی۔

ویسے تو نبی اکرم ﷺ کو اس حیاتِ دُنیوی کے دوران بھی اللہ سے کوئی بُعد نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ کی معیت اور قرب بتمام و کمال حاصل تھا۔ پھر بھی ایک حجاب اور پردہ تو موجود تھا' لہٰذا آپ اب مزید وقت کے لیے دنیا میں رہنے کو تیار نہ تھے۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے بعد کُل ۸۲'۸۰ دن ہیں جو آپ ﷺ کے اس حیاتِ دُنیوی میں گزرے۔ مرض الموت کے دوران جب ذرا افاقہ ہوا تو آپ ﷺ حجرۂ مبارک سے باہر تشریف لائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے' انہوں نے پیچھے ہٹنا چاہا لیکن آپ ﷺ نے اشارے سے منع فرما دیا اور خود حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اب یہ معاملہ تھا کہ آنحضور ﷺ کی امامت میں حضرت ابوبکرؓ رکوع و سجود کر رہے ہیں اور ابوبکرؓ کی

امامت میں ساری جماعت نماز پڑھ رہی ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے خطبہ دیا جس کے الفاظ یوں ہیں: ''اللہ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دے دیا ہے کہ وہ چاہے تو دنیا میں رہے اور اس کی نعمتوں میں سے حصہ پائے' اور چاہے تو اللہ کے پاس آ جائے۔ اللہ کے بندے نے دوسری بات قبول کر لی!'' —— حضرت ابوبکرؓ رو پڑے۔ چونکہ وہ مزاج شناسِ رسول تھے' اس لیے بات کو سمجھ گئے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا جو آخری وقت ہے اس میں ایک تو یہ الفاظ بار بار زبان پر آئے: ﴿مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ﴾ (النساء:۶۹) ''اُن انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین کے ساتھ جن کو اللہ تعالیٰ نے انعامات سے نوازا'' —— اور آخری وقت کے جو الفاظ مروی ہیں وہ یہ ہیں:

اَللّٰهُمَّ فِي الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى اَللّٰهُمَّ فِي الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى

میں سوچا کرتا ہوں کہ اگر میدانِ حشر میں کہیں موقع ملا تو رسول اللہ ﷺ سے شکوہ کریں گے کہ آپؐ نے اس سلسلہ میں جذبۂ محبت خداوندی کے غلبے کی وجہ سے جلدی کی۔ ابھی یہاں بڑی ضرورت تھی کہ انقلاب کا استحکام ہوتا اور مبتدی لوگوں کی تربیت ہوتی۔ پھر ان نئے ایمان لانے والے قبیلوں کو کسوٹی پر پرکھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد ﴿يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ کی بجائے ''يَخْرُجُوْنَ مِنْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا'' کا معاملہ ہو گیا اور لاکھوں لوگ مرتد ہو گئے۔ ارتداد کا فتنہ کوئی فتنہ سا فتنہ تھا! نئے نبیوں کا دعوائے نبوت شروع ہو گیا۔ مُسیلمہ کذّاب کے ساتھ بہت بڑی جنگ ہوئی۔ مانعینِ زکوٰۃ اُٹھ کھڑے ہوئے کہ نماز پڑھوا لو لیکن زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ یہاں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سیرتِ مبارکہ کا یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ اس نحیف الجثہ شخصیت کے پردے میں کیسی چٹان جیسی مضبوط اور پہاڑ جیسی بلند شخصیت موجود تھی۔ شاید حکمت خداوندی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا اظہار مقصود تھا کہ مدعیانِ نبوت اور مانعینِ زکوٰۃ جیسے عظیم فتنے کھڑے ہو گئے' ورنہ شاید دنیا کو معلوم نہ ہوتا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رقیق القلب شخصیت کے اندر کیسا فولادی انسان پنہاں ہے!

یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ہر انقلاب کے بعد اس کا ایک ردِّعمل ضرور ہوتا ہے اور انقلاب مخالف عناصر ابھرتے ہیں۔ مخالف قوتیں جب دیکھتی ہیں کہ ہم اس انقلاب کا راستہ نہیں روک سکتے تو وہ دبک جایا کرتی ہیں اور اپنے اوپر اس انقلاب کا لبادہ اوڑھ لیتی ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ موقع کی تاک میں رہتی ہیں کہ جب بھی موقع ملے گا ہم مناسب اقدام کریں گے۔ ان قوتوں کو reactionary forces یا counter revolutionary movements کہتے ہیں۔ ایسی قوتوں کے لیے اس سے زیادہ سازگار فضا اور کیا ہوگی کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوگیا۔ مسلمانوں کے دلوں میں صدمے کی کیفیت کا آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کا تصور بھی نہیں کرتے ہوں گے کہ نبی اکرم ﷺ کبھی ہم سے جدا ہو جائیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ حال ہوگیا کہ جذبات سے مغلوب ہو کر تلوار سونت کر بیٹھ گئے کہ جس شخص نے کہا کہ محمد ﷺ کا انتقال ہوگیا ہے مَیں اس کی گردن اڑا دوں گا' اور جلالِ فاروقی کے سامنے کس کو دم مارنے کی مجال تھی؟ تمام لوگ دم بخود تھے۔ اس نازک صورت حال کو سنبھالنے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ آئے' سیدھے حجرے میں گئے' آپ ﷺ کے جسدِ اطہر کو بوسہ دیا اور خطبہ دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیٹھ گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا:

اَلَا مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا ﷺ فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ ' وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَإِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ(۱)

''خبردار! جو کوئی محمد ﷺ کی بندگی کرتا تھا وہ سن لے کہ محمد ﷺ کا انتقال ہوگیا ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ کی پرستش کرتا تھا تو (اسے مطمئن رہنا چاہیے کہ) اللہ تعالیٰ زندہ ہے' اسے موت نہیں آئے گی!''

ذرا اندازہ تو کیجیے کہ اُس وقت جو صورت حال درپیش تھی اس میں یہ جملہ کہنے کے لیے کس قدر حوصلہ درکار تھا! اس کے لیے چیتے کے جگر کی ضرورت تھی۔ یہ وہی ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں جن کی رقیق القلبی کا یہ عالَم ہے کہ غزوۂ بدر میں مشورہ دیا کہ ان قیدیوں کو معاف کر دیا

(۱) صحیح البخاری' کتاب المناقب' باب قول النبی ﷺ لو کنت متخذا خلیلا۔

جائے۔ جن کی رائے اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی رائے میں کوئی فرق نہیں۔ پوری تاریخ کے دوران کہیں آپ کو یہ نظر نہیں آئے گا کہ آنحضور ﷺ کی رائے ایک ہو اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دوسری ہو۔ یہ ان ہی کا مقام تھا کہ نبی ﷺ کی وفات کے بعد مذکورہ جملہ کہہ سکتے۔ یہ جملہ وہی کہہ سکتا ہے جس کے روئیں روئیں میں توحیدِ خداوندی رچ بس گئی ہو۔ اس کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَاۗىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓي اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ﴾ (آل عمران)

''اور محمد (ﷺ) تو ایک رسول ہیں' ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ فوت ہو جائیں یا مارے جائیں تو تم الٹے پاؤں لوٹ جاؤ گے؟ اور جو بھی الٹے پاؤں پھر جائے گا تو وہ اللہ کو کچھ ضرر نہ پہنچائے گا' اور اللہ بدلہ دے گا شکر گزاروں کو۔''

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تلوار نیام میں چلی گئی۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ آیت اُسی وقت نازل ہوئی ہے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس قدر شواہد موجود ہیں کہ جب تک کوئی شخص ڈھٹائی' ضد اور تعصب کی پٹی اپنی آنکھوں پر نہ باندھ لے وہ ابوبکرؓ کی خلافت کا انکار نہیں کر سکتا۔ نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں امامت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمائی' اور اس امامت کو آج کی امامت پر قیاس نہ کیجیے گا۔ وہ ہماری یہ امامت نہ تھی جس کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم کہہ گئے ہیں:۔

قوم کیا چیز ہے' قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام!

وہ دو رکعت کی امامت نہ تھی' وہاں دین و دنیا کی وحدت تھی۔ مسجد نبوی کے امامِ اوّل محمد رسول اللہ ﷺ تھے۔ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران ہی خلیفۂ رسول نے امامت

کرائی۔ آنحضور ﷺ نے مسجد نبویؐ کے صحن میں تمام جھروکے بند کروا دیے تھے' سوائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جھروکے کے۔ آپ ﷺ نے مرض الموت میں خطبہ ارشاد فرمایا کہ ابوبکرؓ کی جان و مال نے مجھے جتنا فائدہ پہنچایا کسی اور کی جان و مال نے نہیں پہنچایا۔ ان تمام شواہد کے بعد بھی اگر یہ کہا جائے کہ راہنمائی نہیں تھی تو کتنا غلط ہے! اگرچہ یہ ضرور ہے کہ حکم موجود نہیں تھا۔ آپؐ یہ معاملہ ﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ کے اُصول پر چھوڑ گئے کہ اب مسلمانوں کا معاملہ ان کے حوالے ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے ایک اُمت تشکیل دی' اور وہ ایسی اُمت نہیں ہے کہ جسے شعور نہ ہو اور وہ برے بھلے کی پہچان سے عاری ہو۔ جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم وہ جماعت تھی جس کی تربیت نبی اکرم ﷺ نے فرمائی۔ اور یہ جماعت جانتی تھی کہ کون کس چیز کا اہل ہے۔ لہٰذا اُس وقت جو سب سے زیادہ اہل تھا اُس کو منتخب کر لیا گیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت کا بار اٹھانے کے بعد لوگوں کو تاکید کی کہ نہ تو مجھے خلیفۃ اللہ کہا جائے اور نہ ہی خلیفۃ المسلمین' میں تو خلیفۃ الرسول (اللہ کے رسول کا خلیفہ) ہوں۔ یعنی جو مشن محمد رسول اللہ ﷺ کا تھا اُسی کی تکمیل میرا مقصدِ زندگی ہے۔ خلافت راشدہ عام معنی میں ہیئت حاکمہ نہیں تھی کہ صرف مسلمانوں کی حکومت ہو اور قیامِ امن کے لیے کوئی انتظام ہو۔ یہ اُمور بھی اُس کے اجزاء میں شامل تھے' لیکن اصل مقصد محمد رسول اللہ ﷺ کے مشن کی تکمیل تھا۔ اسی لیے اس کو ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کہا گیا ہے۔

جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا گیا' نبی اکرم ﷺ کی دو بعثتیں ہیں' ایک اِلٰی اَھْلِ الْعَرَب اور دوسرے اِلٰی کَافَّۃ النَّاس۔ اہل عرب کی حد تک تمام فرائض نبی اکرم ﷺ نے خود ادا کر دیے' اور دوسرے عمل کا آغاز فرما کر آپؐ دنیا سے تشریف لے گئے۔ اب اس عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے یہ ادارۂ خلافت وجود میں آیا۔ اس خلافت راشدہ میں پہلی خلافت' خلافتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہے۔ اس ضمن میں آپؓ کا اصل حصہ (contribution) یہ ہے کہ اندرونِ ملک عرب انقلابِ محمدیؐ کی تکمیل کے بعد اس کو

سبوتاژ کرنے کی خاطر اٹھنے والی تمام مخالفانہ قوتوں کے ساتھ نبرد آزما ہو کر اور ان سب کو کچل کر انقلابِ محمدیؐ کو مستحکم بنا دیا۔ اس کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی اس دنیا سے تشریف لے گئے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زندگی میں اگرچہ انقلابِ محمدیؐ کے بین الاقوامی مرحلے کا اجراء تو ہو چکا تھا لیکن اس کا اصل دور خلافتِ عمر رضی اللہ عنہ کا دور ہے۔ اس کا آغاز محمد رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا' تھوڑی سی پیش رفت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوئی۔ شامی فتوحات کے سلسلے کا آغاز ہو گیا۔ لیکن اصل توسیع دورِ فاروقیؓ اور دورِ عثمانیؓ میں ہوئی۔

انقلابِ نبویؐ کو مستحکم کرنے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف سے جس عزیمت کا معاملہ ہوا ہے اس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تقابل کر کے دیکھئے۔ مانعینِ زکوٰۃ کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی اُس وقت کے حالات کی شدت کے پیش نظر مصلحت بینی کا مشورہ دیا کہ یہ چوکھی جنگ ایک دم شروع نہ کیجیے۔ مسلمانوں کے دل زخمی ہیں اور حوصلے پست ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی جدائی سے طبیعتیں بہت پژمردہ اور مضمحل ہیں۔ ایک طرف نئی نبوت کے دعوے دار ہیں اور دوسری طرف مانعینِ زکوٰۃ۔ آپ مدعیانِ نبوت کے خلاف نبرد آزما ہو جائیے اور مانعینِ زکوٰۃ کے بارے میں نرمی اختیار کیجیے۔ اس لیے کہ انہوں نے توحیدِ خداوندی کا انکار نہیں کیا' محمد ﷺ کی نبوت کا انکار نہیں کیا' نماز کا انکار نہیں کیا' صرف زکوٰۃ کا انکار کر رہے ہیں۔ اس لیے مصلحت کو پیش نظر رکھیے۔ نیز جیشِ اُسامہ کو روانہ نہ کیجیے۔ حضرت ابوبکرؓ کا جواب تھا کہ جو جھنڈا نبی اکرم ﷺ نے کھول دیا میں اسے کیسے تہ کر سکتا ہوں؟ پھر یہ خلافت تو نہ ہوئی اور ان کے مشن کی طرف کوئی اقدام تو نہ ہوا! آپ ﷺ کے اٹھائے ہوئے قدم کو واپس لے لوں تو خلافت کا کیا فائدہ؟ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کی:

((اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْهَدُوْا اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوا الزَّكٰوةَ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّیْ

دِمَاءَ هُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ)) (۱)

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ مَیں لوگوں کے ساتھ جنگ کروں تا آنکہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ پس جب وہ یہ کر لیں گے تو میری طرف سے اُن کے جان و مال' سوائے اسلامی قانون کے' محفوظ ہو جائیں گے' اور اُن کے باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے!''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ اہلِ عرب کے ساتھ جنگ اگر بند ہو سکتی ہے تو مندرجہ بالا تین شرائط کی بنیاد پر' جو کم از کم ہیں' اور مَیں ان میں کوئی ترمیم کرنے کے لیے تیار نہیں! یہ ہے وہ عزیمت جس کے حامل ہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ آپؓ کے الفاظ نقل ہوئے ہیں کہ اگر کوئی میرے ساتھ نہ نکلے گا تو میں تنہا جنگ کروں گا۔ اللہ تعالیٰ کی تائید شاملِ حال ہوئی اور آپؓ تمام مخالفانہ قوتوں کو کچل کر اندرونِ ملک اس انقلاب کو مستحکم کر گئے۔ مشیتِ الٰہی کے آگے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔ اگر یہ استحکام خود رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں ہوا ہوتا تو ممکن ہے کہ خلافتِ راشدہ کا عہد تیس برس کی بجائے تین سو برس تک جاری رہتا۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔

کیا عجب مشیتِ ایزدی کا یہی منشا ہو کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ذاتی عظمت نمایاں ہو کر سامنے آئے۔ اگر یہ تمام مراحل حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے بنفسِ نفیس طے کرا دیے ہوتے تو ابوبکر صدیق کی عظمت کیسے نمایاں ہوتی؟ اس اللہ کے بندے نے تو رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران اپنے آپ کو اس طرح گم کر دیا تھا کہ ان کا آنحضور ﷺ سے کہیں جداگانہ تشخص نظر نہیں آتا۔

بہرحال یہ کارنامۂ صدیقی ہے جو تمہید بنا ہے اس بات کے لیے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ یکسو ہو کر انقلابِ نبویؐ کے بین الاقوامی مرحلے کی طرف متوجہ ہو گئے' جس کا

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب فان تابوا واقاموا الصلاۃ واتوا الزکاۃ فخلوا سبیلھم۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الامر بقتال الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللّٰہ۔

ایک سیلاب امڈ آیا۔ اسی سیلاب کے متعلق علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا تھا:۔

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا!

اس پر ''اِن شاء اللہ'' آئندہ نشست میں گفتگو ہوگی، جس میں خلافتِ فاروقی وعثمانی اور خاص طور پر ''الفتنة الکبریٰ'' یعنی شہادت حضرت عثمان ذُوالنُّورین رضی اللہ عنہ اور اس کے بعد جو حالات وواقعات پیش آئے، وہ بیان کیے جائیں گے۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات
وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین oo

سلسلۂ خُطبات ⑥

خلافتِ فاروقیؓ وعثمانیؓ

اور

انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی توسیع

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۲۸﴾ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِيْلِ ۖ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾﴾ (الفتح)

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِیْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِیْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾﴾ (النور)

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ
اَللّٰهُمَّ اَلْهِمْنِیْ رُشْدِیْ وَاَعِذْنِیْ مِنْ شُرُوْرِ نَفْسِیْ۔ اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ
وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ ..... آمین یَارَبَّ الْعَالَمِیْنَ!

مَیں اپنے دروس و خطابات کا آغاز بالعموم ان دعاؤں سے کیا کرتا ہوں۔ یہ دونوں دعائیں اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ بیان کرنے والا اپنے حق میں بھی دعا کرے اور سامعین کے حق میں بھی دعا کرے: اَللّٰهُمَّ اَلْهِمْنِیْ رُشْدِیْ ''اے اللہ! میرے دل میں وہی بات ڈال جو حق ہو' درست ہو' صحیح ہو''۔ وَاَعِذْنِیْ مِنْ شُرُوْرِ نَفْسِیْ ''اور مجھے میرے نفس کی شرارتوں سے اپنی پناہ میں لے لے''۔ کہیں کوئی نفسانیت' کوئی عصبیت جاہلیہ' کوئی تعصب' کوئی گروہی یا طبقاتی یا فرقہ وارانہ ضد اور ہٹ دھرمی میرے نقطۂ نظر اور میری رائے کو کج نہ کر دے۔ دوسری دعا ہے: اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ ''اے پروردگار! ہمیں حق کو حق دکھا (ہم حق کو حق ہی دیکھیں' حق کو حق ہی سمجھیں) اور ہمیں اس کے اتباع کی توفیق عطا فرما''۔ اس میں اوّلاً حق کی پہچان اور ثانیاً اس کی اتباع کی توفیق کے لیے دعا کی گئی ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں مرحلے کٹھن ہیں۔ حق کے پہچاننے کے لیے بہرحال کچھ شرائط ہیں' جن میں خلوصِ نیت کو اوّلیت حاصل ہے' لیکن حق کا پہچاننا جتنا مشکل ہے' پہچاننے کے بعد اس کو قبول اور اختیار کر لینا اس سے بدرجہا مشکل ہے۔ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا ''اور ہمیں باطل کو باطل دکھا''۔ ایسا نہ ہو کہ تلبیس ابلیس لعین سے حق کو باطل سمجھ بیٹھیں یا باطل کو حق سمجھ لیں! وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ ''اور ہمیں اس سے اجتناب کی توفیق عطا فرما''۔ یہ دونوں دعائیں بڑی اہم ہیں۔ عام حالات میں بھی ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے' لیکن بالخصوص آج کا جو موضوع ہے' اس کے اعتبار سے اپنے حق میں بھی اور آپ سب کے حق میں بھی پورے خلوصِ قلب کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں یہ دونوں دعائیں کر رہا ہوں۔

چند اہم نکات کا اعادہ

اب آیئے اصل موضوع کی طرف' اور اس کے لیے چند بنیادی باتیں ذہن میں

تازہ کر لیجیے۔ اس سلسلۂ تقاریر میں ہمارا نقطۂ آغاز یہ تھا کہ نبوت کا اصل مقصد محاسبۂ اُخروی کے ضمن میں انسانوں پر اتمامِ حجت ہے' مبادا وہ یہ عذر پیش کر سکیں کہ اے ربّ! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تو کیا چاہتا ہے۔ اس ضمن میں اوّلین حجت تو انسان کی فطرت میں ودیعت شدہ حقائق ہیں' مثلاً سماعت ہے' بصارت ہے' عقل و شعور کی صلاحیتیں ہیں' نیکی اور بدی کی تمیز ہے' قلب میں ودیعت شدہ معرفتِ ربانی ہے' روح کی گہرائیوں میں سلگتا ہوا عشقِ خداوندی کا جذبہ ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی بنیاد پر ہر انسان مسئول اور جواب دہ ہے' لیکن رحمتِ خداوندی کا تقاضا ہوا کہ انسانوں کے لیے مزید آسانی پیدا کی جائے اور اس عظیم امتحان میں کچھ اور سہولتیں دی جائیں۔ چنانچہ وحی کا سلسلہ جاری فرمایا گیا' ہدایتِ ربانی نازل ہوتی رہی تاکہ عقل و خرد' شعور اور فطرت کے اندر جو صلاحیتیں مضمر ہیں' اُن کو اُجاگر کیا جائے۔ انبیاء کرام علیہم السلام نے حق اور عدل و راستی کی طرف دعوت بھی دی اور اس پر عملاً چل کر بھی دکھایا۔ قافلۂ نبوت قافلۂ انسانیت کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پہلا انسان پہلا نبی بھی تھا۔ حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے قافلۂ انسانی نے بھی ارتقائی مراحل طے کیے اور نبوت و رسالت بھی ساتھ ساتھ ارتقائی مراحل طے کرتی رہی' تا آنکہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر نبوت و رسالت اتمام اور تکمیل کو پہنچ گئی اور نتیجتاً ختم ہوگئی۔ ختمِ نبوت نتیجہ ہے اتمامِ نبوت اور تکمیلِ رسالت کا۔

اس اتمام و تکمیلِ رسالت کے تین پہلو اہم ہیں۔ ایک یہ کہ نوعِ انسانی بحیثیتِ مجموعی عقل و شعور کی صلاحیتوں کے اعتبار سے عہدِ طفولیت سے نکل کر بلوغ کی عمر کو پہنچ گئی' لہٰذا اس قابل ہوگئی کہ الہدیٰ (کامل ہدایت نامہ' ابدی ہدایت نامہ) اب اس کو عطا کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ قرآن مجید کی صورت میں محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا اور اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے لیا۔

دوسری طرف انسان کا اجتماعی شعور بھی ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا وہاں تک پہنچ گیا کہ اُس دور کا آغاز ہو رہا تھا جس میں اجتماعیت انفرادیت پر غالب آ جانے والی تھی' ہیئتِ اجتماعیہ اور نظامِ اجتماعی کی اہمیت فیصلہ کن ہو جانے والی تھی' افراد اس کے شکنجے میں

جکڑے جانے والے تھے۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت تھی کہ اب صرف انفرادی ہدایت و رہنمائی نہیں' اجتماعی ہدایت و رہنمائی عطا کی جائے' ایک ایسا نظامِ عدل وقسط عطا کیا جائے جس میں انسان کے جملہ عواطف ومیلانات اور اس کی فطرت وطبیعت کے تمام جبلی رجحانات کی تشفی کا پورا اہتمام ہو اور اُن میں بتمام وکمال توازن واعتدال ملحوظ رکھا گیا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ ایک چیز پر زور دیا تو دوسری چیز ہاتھ سے جاتی رہی۔ آزادی پر زور دیا تو اونچ نیچ اس انتہا کو پہنچ گئی کہ انسانیت طبقات میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔ مساوات پر زور دیا تو آزادی کی چڑیا ہاتھ سے اڑ گئی۔ اس کے برعکس تمام چیزیں بیک وقت ایک اجتماعی نظام میں سموئی ہوئی پورے توازن اور اعتدال کے ساتھ دینِ حق ''اسلام'' کی صورت میں انسان کو دے دی گئیں' اور اس نظام کو چلا کر دکھا دیا گیا تاکہ نوعِ انسانی پر ہمیشہ ہمیش کے لیے یہ حجت بھی بتمام وکمال پوری ہو جائے۔

اسی ختمِ نبوت کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ سابقہ تمام انبیاء ورُسل صرف اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوئے اور انبیاء ورُسل کی اس مقدس جماعت میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ﷺ فداہ آباء نا واُمّھاتنا پہلے اور آخری فرد ہیں جن کی بعثت تمام نوعِ انسانی کی طرف ہوئی' پورے کرۂ ارضی کے لیے مکان کے اعتبار سے اور تا قیامِ قیامت زمان کے اعتبار سے' ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء) اور: ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ (سبا:۲۸) آپ ﷺ مبشر اور نذیر بن کر آئے۔ یہی بشارت اور انذار محمد رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت ہے۔

ان تین امتیازات کے ساتھ آنحضور ﷺ کو ایک تو ہدایتِ کاملہ عطا کر دی گئی اور اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا گیا۔ دوسرے صرف انفرادی رہنمائی نہیں' نظامِ اجتماعی کے اعتبار سے ایک متوازن اور معتدل نظامِ عدل وقسط یعنی ''الدّینُ القیّم'' عطا کر دیا گیا اور نبی اکرم ﷺ نے ۲۳ سالہ محنتِ شاقہ کے نتیجہ میں دونوں کام کر دیے۔ الہدیٰ کی تبلیغ مکمل کی اور اس پر حجۃ الوداع میں گواہی لے لی۔ دوسری طرف اس نظامِ عدلِ اجتماعی کو'

دین حق کو بالفعل قائم کر دیا۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلابِ اسلامی کی تکمیل ہو گئی' اللہ کا دین غالب ہو گیا' کفر اور شرک کا استیصال ہو گیا۔ زیادہ سے زیادہ اہل کتاب کو یہ چھوٹ دی گئی کہ وہ چاہیں تو اپنے دین یہودیت اور نصرانیت پر قائم رہیں' البتہ اپنے ہاتھوں جزیہ دینا ہو گا اور چھوٹے بن کر رہنا ہو گا۔ اس لیے کہ بڑا تو اللہ ہے' بڑائی اللہ کے لیے ہے اور غلبہ اللہ کے دین کے لیے ہے۔ یہ اسی تکبیرِ ربّ کا ظہور اور اس کا تقاضا ہے۔

یہ دونوں کام وہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے اہلِ عرب اور جزیرہ نمائے عرب کی حد تک بنفسِ نفیس خود سرانجام دے دیے۔ آپؐ کے کام کا تیسرا پہلو تھا مذکورہ بالا امور کی عالمی سطح پر تکمیل۔ اب یہ فرضِ منصبی قرار پایا اُمتِ محمد یہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا۔ خطبۂ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے قرآن مجید کے بارے میں ہدایت دے دی کہ ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) ''اب پہنچائیں وہ جو یہاں موجود ہیں' اُن کو جو یہاں موجود نہیں''۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ ان بلیغ الفاظ میں وہ اقوام بھی شامل ہیں جو اُس وقت جزیرہ نمائے عرب کے باہر تھیں۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا کہ:

بس رہے تھے یہیں سلجوقی بھی' تورانی بھی
اہلِ چیں چین میں' ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی
اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی

تو نمعلوم کتنی اقوام تھیں' وہ بھی شامل ہو گئیں اور تا قیامِ قیامت آنے والے تمام افرادِ انسانی بھی اس لفظ ''غائب'' میں شامل ہو گئے۔

دوسرا پہلو ہے دین حق کو عالمی سطح پر پھیلانے کا۔ تو اس کا رسول اللہ ﷺ نے بنفسِ نفیس آغاز فرما دیا۔ سربراہانِ ممالک کے نام دعوتی خطوط لکھے جن کے نتیجے میں سلطنتِ روم سے تصادم کا آغاز ہو گیا۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ روم اور ایران کے مابین تصادم میں مسلمانوں کی ہمدردیاں سلطنتِ روما کے ساتھ تھیں' لیکن یہ تاریخ کے عجیب حقائق ہیں کہ اسی سلطنتِ روما سے تصادم کا آغاز ہوا' سلطنتِ ایران کے ساتھ تصادم بعد میں ہوا۔

کیا اسلام تلوار کے زور پر پھیلا؟

ایک مسئلہ ہمارے ہاں بڑا ہی پیچیدہ بنا ہوا ہے کہ آیا اسلام تلوار کے زور پر پھیلا؟ ایک جانب سے الزام عائد کیا گیا اور دوسری جانب سے مدافعانہ اور معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا گیا اور حقیقت اسی خرافات میں کھو کر رہ گئی۔ مغرب اور عالم عیسائیت کی طرف سے اہلِ اسلام پر الزام عائد کیا گیا کہ ع ''بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے!'' یہ مسلمان بڑے وحشی لوگ تھے' انہوں نے اپنا دین بالجبر تلوار کے زور سے پھیلایا ہے۔ ہم تبلیغ کرتے ہیں' ہم دلوں کو جیتتے ہیں' ہمارے مشن کبھی بھی عیسائیت کی تبلیغ کے لیے جبر اور طاقت کا استعمال نہیں کرتے' جب کہ اسلام اس کے برعکس انداز میں قوت سے پھیلا ہے' طاقت سے پھیلا ہے' تلوار سے پھیلا ہے۔ یہ ایک ایسا الزام ہے جس سے اسلام اور مسلمانوں کی ایک بھیانک تصویر دنیا کے سامنے آتی ہے۔ نتیجتاً ہمارے ہاں دین وملت کے ساتھ خیر خواہی رکھنے والے بعض نیک اور بھلے لوگوں نے مدافعت کی اور انتہائی معذرت خواہانہ انداز میں وضاحت پیش کی کہ نہیں نہیں' یہ بات نہیں ہے' اسلام میں جنگ تو صرف مدافعت کے لیے جائز ہے' جارحانہ جنگ اسلام میں ہے ہی نہیں۔ ہمارے ہاں یہ انداز سرسید احمد خان مرحوم اور ان کے رفقاء نے اختیار کیا۔ ان کا خلوص واخلاص شک وشبہ سے بالاتر ہے' لیکن ہر دور کا کچھ اثر ہوتا ہے جس سے بچنا آسان نہیں ہوتا۔

یہ بات جان لینی چاہیے کہ اس معاملے میں اصل نقطۂ عدل ہے کیا؟ گزشتہ تقریروں میں دو مواقع پر یہ مسئلہ ضمنی طور پر زیر بحث آ چکا ہے۔ ہجرت کے فوراً بعد جب سلسلۂ غزوات کا آغاز ہوا تو میں نے عرض کیا تھا کہ یہ نہ سمجھئے کہ اگر اہل مکہ کی طرف سے کوئی پیش قدمی نہ ہوتی تو رسول اللہ ﷺ بھی مدینہ منورہ میں اطمینان سے بیٹھے رہتے۔ اگر ایسا ہوتا تو دین حق کا غلبہ کیسے ہوتا؟ کفر اور شرک کا استیصال کیسے ہوتا؟ اللہ کا وہ گھر جو بُت کدہ بنا ہوا تھا اُسے نجاست سے پاک کیسے کیا جاتا؟ پُرامن بقائے باہمی (peaceful coexistence) اور غیر متبدل حالت (status quo) وغیرہ بڑے

خوبصورت سے نام ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں ان کا وجود کہیں نہیں ہے۔ حق اور باطل دو ایسی تلواریں ہیں جو ایک نیام میں نہیں سما سکتیں' حق اور باطل ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہوئے اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتے۔ حق آئے گا تو باطل پیچھے ہٹے گا' باطل بڑھے گا تو حق دبے گا۔ ان میں کوئی مناسبت نہیں ہے' یہ ایک دوسرے کو گوارا نہیں کر سکتے۔ قرآن حکیم میں دوٹوک انداز میں فرمایا گیا ہے: ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾﴾ (بنی اسراء یل) ''حق آیا اور باطل نکل بھاگا' بے شک باطل ہے ہی نکل بھاگنے والا''۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے ہجرت کے بعد از خود اقدام فرمایا اور اہلِ مکہ کی معاشی ناکہ بندی (economic blockade) کر کے گویا ان کی شہ رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اسی طرح اگر نبی اکرم ﷺ ایک سفیر کے قتل کو برداشت کر لیتے تو جنگ موتہ نہ ہوتی' اور یہ جنگ نہ ہوتی تو سفر تبوک نہ ہوتا۔ جنگ موتہ کے نتیجہ میں اگر مسلمانوں کو کچھ نقصان اٹھانا پڑا تو غزوۂ تبوک میں نبی اکرم ﷺ کو اس سے کہیں زیادہ کامیابی حاصل ہوگئی۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس سے مسلمانوں کا دبدبہ قائم ہو گیا۔ آپ ﷺ تیس ہزار مسلمانوں کے ساتھ بیس دن تک تبوک میں مقیم رہے اور قیصر مقابلے میں نہیں آ سکا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ علاقے کے تمام سردار' رؤسا اور قبائلی شیوخ حاضر خدمت ہوتے رہے' کسی نے اسلام قبول کر لیا' کسی نے معاہدہ کر لیا۔

اس کے بعد آپؐ نے جیش اُسامہ کس لیے تیار کیا؟ کوئی تازہ اشتعال انگیزی (provocation) تاریخ کے ریکارڈ میں موجود نہیں ہے' لیکن جیشِ اُسامہ تیار ہے' جبکہ نبی اکرم ﷺ کا انتقال ہو گیا۔ مَیں یہ عرض کر چکا ہوں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بڑے پرزور طریقے سے مشورہ دیا گیا کہ ان تین محاذوں میں سے کم از کم ایک محاذ کو ابھی آپ بند کر دیں' بیک وقت تین محاذوں کا کھولنا حکمت کے خلاف ہوگا' لیکن وہ تو خلیفۂ کامل تھے۔ جیسے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ رسولِ کامل ہیں' اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفۂ کامل تھے۔ خلافت کا جامہ بتمام و کمال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی

شخصیت پر راست آتا ہے۔ انہوں نے اس مشورہ کے جواب میں فرمایا کہ جس کام کا آغاز رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا میں اس سے قدم کیسے پیچھے ہٹالوں؟ جو کم سے کم شرائط محمد رسول اللہ ﷺ نے معین کر دیں' ان سے کم پر میری صلح کیسے ہو سکتی ہے؟ اگر ایسا کروں گا تو یہ دین میں ترمیم ہو جائے گی۔ انقلابی نظریات کے ضمن میں ایک اصطلاح ترمیم پسندی (revisionism) کی استعمال ہوتی ہے۔ جب کوئی انقلابی نظریہ آتا ہے' وہ قائم ہوتا ہے تو کچھ عرصہ بعد اس کے پیرو سوچتے ہیں کہ اس پر چلنا مشکل ہے' لہٰذا کچھ ترمیم کر دی جائے۔ روس اور چین کے درمیان یہی بات بنائے نزاع رہی ہے اور چینی اشتراکیوں کا روسیوں پر یہ سب سے بڑا الزام تھا کہ یہ ترمیم پسند (revisionists) ہیں۔ مارکس کا جو اصل فلسفہ تھا اور لینن کا جو اصل انقلاب تھا روس اس پر قائم نہیں رہا اور انہوں نے اس سے عملی انحراف کیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اگر رسول اللہ ﷺ کی کم سے کم شرائط میں سے کسی کو کم کر دیتے تو یہ وہ ''ترمیم پسندی'' ہوتی جس سے نبی اکرم ﷺ کے موقف میں ترمیم ہو جاتی' جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کسی طرح ممکن نہ تھی۔ چنانچہ جیش اُسامہؓ روانہ کیا گیا اور وہی سلطنتِ روما کے ساتھ باقاعدہ جنگوں کی تمہید بن گیا اور فتوحاتِ شام شروع ہو گئیں۔

نظامِ باطل کے خاتمہ میں طاقت کا استعمال

ان دونوں باتوں کو ذہن میں رکھیے' کیونکہ یہ اپنی جگہ اٹل تاریخی حقائق ہیں۔ قرآن مجید کے مطالعہ کی روشنی میں جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس معاملے میں نقطۂ عدل کچھ اس طرح بَین بَین واقع ہوا ہے کہ یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ اسلام کی تبلیغ میں تلوار کو سرے سے کوئی دخل نہیں اور یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اسلام کی تبلیغ ہی تلوار کے بل پر ہوئی۔ اسلام دو چیزوں میں بڑا بنیادی فرق کرتا ہے' ایک ہیں افراد اور ایک ہے نظامِ اجتماعی۔ افراد میں سے کسی فرد کو اپنا دین تبدیل کرنے پر اسلام مجبور نہیں کرتا۔ پوری تاریخ میں کسی ایک بھی ایسے واقعہ کا ذکر نہیں ملتا' لیکن غلط بنیادوں پر مبنی نظامِ اجتماعی کو اسلام گوارا نہیں کر سکتا۔ اس کو ملیامیٹ کرنا اور اسے بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنا مسلمانوں

کے لیے نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر طاقت نہیں ہے تو بات اور ہے' لیکن اگر طاقت موجود ہو اور کسی باطل نظام کا وجود گوارا کر لیا جائے تو یہ ایمان کے منافی ہے۔ غلط نظام کو قوت کے بل پر توڑا جائے گا۔ اس کی وجہ سمجھ لیجیے اور یہ فلسفۂ دین کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ درحقیقت غلط نظام بندوں اور ربّ کے درمیان حجاب بن جاتا ہے۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی جہاں اور بڑی خدمات ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایک بہت بڑے عمرانی مفکر کی حیثیت سے' دو اعتبارات سے اس نظامِ اجتماعی کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ اگر نظام ظالمانہ یا استحصالی ہو تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کچھ لوگوں کے پاس عیش و عشرت کے لیے ہر چیز کی فراوانی ہوتی ہے اور کچھ لوگ دو وقت کی نانِ جویں کے لیے محتاج ہو جاتے ہیں۔ جن کے پاس دولت کی فراوانی ہوتی ہے وہ اس کی وجہ سے خدا سے دور ہو جاتے ہیں اور جن کے لیے دو وقت کی روٹی کا حصول مشکل ہو گیا ہے وہ بالکل ڈھور ڈنگروں کی سطح پر آ جاتے ہیں' وہ خدا کو کیا پہچانیں اور اس کی کیا بندگی کریں؟ وہ تو دو وقت کی روٹی کے لیے جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں' جیسے بار برداری کا اونٹ یا کولہو کا بیل ہو۔ اگر انسان کو اس سطح پر گرا دیا جائے تو اس کا کہاں امکان ہے کہ وہ غور و فکر کرے کہ یہ آسمان کس نے بنایا' یہ زمین کس نے بنائی اور فطرت کے اشارات کو پڑھے: ع

کھول آنکھ' زمیں دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ!

کہاں معرفتِ ربانی اور عبادتِ ربانی! انسان ان چیزوں سے بالکل بیگانہ ہو جاتا ہے اور یہ ظالمانہ نظام بندے اور ربّ کے درمیان سب سے بڑا حجاب بن جاتا ہے۔ یہ ہے اہمیت نظامِ اجتماعی کی۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ (الحدید:۲۵)

''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔''

سورۃ الشوریٰ میں آنحضور ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ﴾ (آیت ۱۵)

''اور آپ یہ بھی کہہ دیجیے کہ میں ایمان لایا ہر کتاب پر جو اللہ نے اتاری ہے' اور مجھے حکم ہوا ہے کہ تمہارے مابین عدل کروں۔''

یہی بات ہے جو خلیفۂ کامل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمائی۔ بیعتِ خلافت کے بعد آپؓ نے جو پہلا خطبہ دیا اس میں خلافت کی غرض و غایت ان الفاظ میں بیان فرمائی:

''مسلمانو! تم میں ہر قوی میرے نزدیک ضعیف ہے جب تک کہ اُس سے حق وصول نہ کرلوں' اور ہر ضعیف قوی ہے جب تک کہ مَیں اس کا حق نہ دلوادوں۔''

یہ ہے اس بات کی اہمیت کہ نظامِ باطل کو کسی درجے میں بھی گوارا نہ کیا جائے۔ یہ ظالمانہ نظام ہے جو کسی ایک خاندان کو نوعِ انسانی کی گردن پر مسلط کر رہا ہے کہ وہ حاکم ہے یہ محکوم ہے۔ بقول اقبال: ع

''تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے!''

کہیں اس نے سرمایہ کو ایک لعنت بنا کر مسلط کر دیا ہے اور انسانوں کو دو طبقات میں تقسیم کر دیا ہے' ایک محروم طبقہ اور دوسرا وہ طبقہ جنہیں فراوانی کا ہیضہ ہو گیا ہے۔ جن کی ایک ایک تقریب پر لاکھوں روپے صرف ہو جاتے ہیں۔

مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک زمانے میں جبکہ لاہور میں میرے درس کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا' ایک صاحب سمن آباد میں میرے درس میں شریک ہوا کرتے تھے' ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد اُن کے لڑکے کی شادی کا مرحلہ آیا تو اس نے آکر مجھ سے کہا کہ اگر ابا جان زندہ ہوتے تو یقیناً آپ سے درخواست کرتے کہ آپ نکاح پڑھائیں' لہٰذا میری درخواست ہے کہ میرا نکاح آپ پڑھائیں۔ میں نے ہامی بھر لی۔ یہ ۶۸۔۱۹۶۷ء کی بات ہے۔ میں وہاں گیا اور مَیں نے شادی کا جو نقشہ وہاں دیکھا' معلوم ہوتا تھا کہ ہر درخت کے ہر پتے کے ساتھ ایک قمقمہ لگا ہوا ہے۔ روشنیوں کا ایک طوفان' لاتعداد مہمان'

بہترین یونیفارم میں ملبوس بیرے اور اسراف وتبذیر کے تمام تر سامان موجود تھے۔ اس موقع پر میں نے وہاں جو تقریر کی وہ میری زندگی کی سخت ترین تقاریر میں سے تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں خطبۂ نکاح جنتر منتر کے انداز میں تو پڑھتا نہیں ہوں۔ خطبہ تو خطبہ ہوتا ہے، جس کی غرض تذکیر ہے۔ مَیں نے کہا کہ یہ ہماری منافقت ہے کہ ہم نام لیتے ہیں فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا اور عمل ہمارا یہ ہے! یعنی قول وفعل میں بالکل مطابقت نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب نصیحت فرمائی ہے:

اگر پندے ز درویشے پذیری
ہزار اُمت بمیرد تو نہ میری!
بتولؓ باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرےؓ بگیری!

''اگر تو کسی درویش سے کوئی نصیحت حاصل کرنا چاہتی ہے تو میری یہ نصیحت اپنی گرہ میں باندھ لے۔ خواہ ہزاروں قومیں نیست و نابود ہو جائیں اے مسلمان عورت، کہیں تو نہ مر جانا! تو حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا اُسوہ اختیار کر اور اس زمانے کی آنکھ سے اوجھل رہ، تاکہ تیری آغوش میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسے نونہال پروان چڑھیں۔''

اُس زمانے میں سرخ ٹوپیوں والوں کے بڑے بڑے جلوس نکلتے تھے اور سرمایہ دار بڑا گھبرا رہا تھا کہ کیا ہونے والا ہے! مَیں نے اپنے خطاب میں کہا کہ یہ کہاں سے آ گئے ہیں؟ یہ کہیں روس سے تو نہیں آئے، یہ آپ کی ان غلط حرکتوں کا نتیجہ ہے جو سامنے آ رہا ہے۔ میں نے کہا ذرا سوچیے، یہی بیرے جو آپ کو serve کر رہے ہیں، اور ایسے ہی آپ کے شوفر، آپ کے چوکیدار، آپ کے خانسامے وغیرہ، ان میں سے کتنے ایسے ہوں گے جن کے گھروں میں جوان بچیاں بیٹھی ہوں گی اور وہ اُن کے ہاتھ پیلے نہیں کر سکتے، شادی بیاہ کے جو کم سے کم لوازمات ہیں وہ بھی ان کو میسر نہیں اور آپ کے ہاں یہ اللّے تللّے ہو رہے ہیں!

چنانچہ یہ حقیقت خوب سمجھ لیجیے کہ اسلام نظامِ باطل کو کسی صورت گوارا نہیں کرتا' بلکہ اس کا قلع قمع کرتا ہے۔ اسلام اس کے لیے طاقت استعمال کرتا ہے۔ اگر طاقت موجود نہ ہو تو الگ بات ہے' لیکن اگر موجود ہو تو وہ تلوار استعمال کرتا ہے۔ مَیں عرض کر چکا ہوں کہ مسلمانوں نے ہمیشہ تین متبادل (alternatives) دیے ہیں' جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دیے ہوئے ہیں: (۱) اسلام لے آؤ' اس صورت میں تم ہمارے بھائی ہو گے۔ جس طرح کسی دوسرے مسلمان کا جان و مال محترم ہے' ایسے ہی تمہارے جان و مال کا احترام ہو گا۔ (۲) اگر یہ نہیں کرتے تو چھوٹے بن کر رہو' جزیہ دو' تمہیں کوئی بالجبر مسلمان نہیں کرے گا۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ﴾ (التوبۃ) یہودی اور عیسائی رہو' لیکن چھوٹے ہو کر رہنا پڑے گا۔ آئینِ ملکی (Law of the Land) اس کا ہو گا جس کی فی الواقع زمین ہے' کیونکہ ''اَلْاَرْضُ لِلّٰهِ' اَلْمُلْكُ لِلّٰهِ!'' البتہ پرسنل لاء میں تمہیں آزادی ہے' جو چاہو کرو۔ اور (۳) اگر یہ دونوں چیزیں منظور نہیں ہیں تو میدان میں آؤ' تلوار ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔ یہ تاریخ کی وہ حقیقت ہے جس کے لیے کسی تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں ہے۔ جس نے کبھی تاریخ اسلام کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے وہ بھی جانتا ہے کہ یہی تین متبادل ہمیشہ پیش کیے گئے ہیں۔ لہٰذا اس نقطہ عدل کو پہچان لیجیے۔ کسی فرد کو کبھی مجبور نہیں کیا گیا' نہ کیا جائے گا' از روئے الفاظ قرآنی:

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۵۶)

''دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے' بے شک جدا ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے۔''

لیکن نظامِ باطل جو یقیناً ظالمانہ نظام ہے' اسے مسلمان ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتا۔ اسلام اس کے وجود کو اپنے لیے چیلنج سمجھتا ہے اور اس کا قلع قمع جبر اور قوت کے ساتھ اسلام کا نصب العین ہے۔

اس اعتبار سے اگر مسلمانوں کے پاس طاقت ہو تو نظامِ باطل کا قلع قمع کرنے کے

لیے اس طاقت کا استعمال ضروری ہے۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ کے دوران فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ کے نمائندے حضرت ربعی بن عامر ؓ سے جب ایرانیوں نے پوچھا کہ آپ لوگ ہم پر چڑھائی کر کے کیوں آئے ہو؟ تو انہوں نے جواب میں جو جملہ فرمایا اسے خلافتِ راشدہ کے ماٹو (motto) کی حیثیت حاصل ہے۔ اس سے پہلے اس تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھئے کہ اُس وقت روئے ارضی پر دو عظیم سلطنتیں تھیں جو اپنے وقت کی سپر پاورز تھیں۔ ایک سلطنتِ کسریٰ اور دوسری سلطنتِ روما۔ جزیرہ نمائے عرب کا علاقہ ان دونوں کے درمیان واقع تھا جو ایک لق و دق صحرا تھا۔ دونوں سلطنتوں میں سے ہر ایک عربوں کو اپنے زیر اثر رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ ویسے درحقیقت یہ آزاد قبائلی علاقہ تھا' اور اس طرح کے دیگر علاقوں کے باشندوں کی طرح عربوں کا پیشہ بھی بالعموم لوٹ مار تھا۔ ظاہر بات ہے کہ جب اپنے گھر میں پیدا کچھ نہ ہوتا ہو تو کہاں سے کھائیں گے؟ چنانچہ عربوں میں یہی طریقہ رائج تھا کہ کہیں جا کر ہلّہ بول دیا اور کچھ لوٹ مار کر کے لے آئے۔ چنانچہ ایرانیوں نے یہ کہا تھا کہ تم پہلے تو اس طرح آیا کرتے تھے اور لوٹ مار کر کے واپس چلے جایا کرتے تھے' اب تم کسی طرح ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتے' یہ فرق کیوں ہے؟ ہم تمہیں کچھ دے دلا دیتے ہیں' جو کہتے ہو دے دیتے ہیں۔ اس موقع پر حضرت ربعی بن عامرؓ نے جو تاریخی جملہ کہا اس کا ایک ایک لفظ نوٹ کر لیجیے۔ قادسیہ کے محاذ پر اسلامی افواج کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ نے جنگ سے پہلے ایرانیوں کے ساتھ مذاکرات کے لیے حضرت ربعی بن عامر ؓ کو بھیجا تھا۔ ایرانی افواج کے سپہ سالار رستم نے جب ان سے یہ سوال کیا کہ تم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہو؟ تو انہوں نے اپنے مشن کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی:

اِنَّ اللّٰہ ابتعثنا لنخرج العباد من عبادۃ العباد الی عبادۃ ربِّ العباد' ومن ضیق الدُّنیا الی سِعَۃ الآخرۃ ومن جور الادیان الی عدل الاسلام

''ہمیں اللہ نے بھیجا ہے تا کہ ہم بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر بندوں کے رب کی غلامی میں لے آئیں' اور انہیں دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی

کشادگی سے ہم کنار کریں' اور باطل نظاموں سے نجات دلا کر اسلام کے عادلانہ نظام سے روشناس کرائیں۔''

یعنی ہم اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں' خود نہیں آئے۔ پہلے ہم لوٹ مار کرنے آتے تھے' لیکن اب ہم ایک مشن پر ہیں۔ یہ رسالت محمدیؐ کا مشن ہے' جس کی تکمیل پر ہم مامور ہیں۔ ہمیں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ ہم انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر انسانوں کے پروردگار کی غلامی میں لے آئیں۔ لوگوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لے آئیں اور بادشاہوں کے ظلم و تشدد کی چکی سے' جس میں وہ پس رہے ہیں' نکال کر اسلام کے عدل کی طرف لے آئیں۔ یہ خلافت راشدہ کا مشن ہے' یہ ماٹو (motto) ہے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ خلافت راشدہ کو صرف مسلمانوں کی ایک حکومت یا صرف ایک سیاسی نظام نہ سمجھئے۔ اگرچہ ایک سیاسی نظام یا ہیئت اجتماعیہ کے اعتبار سے بھی اس کی برکات بڑی ممتاز ہیں' لیکن اسے اگر صرف اس حد تک سمجھیں گے اور اس اعتبار سے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں گے تو اس کی پوری تصویر سامنے نہیں آ سکے گی۔ وہ تو درحقیقت جانشینیٔ رسول ﷺ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہے۔

اس خلافت کے سلسلے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر گفتگو گزشتہ نشست میں ہو چکی ہے کہ یہ دورِ خلافت مختصر تھا' لیکن کارنامہ انتہائی عظیم تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد انقلابِ محمدی ﷺ کے خلاف جتنی قوتیں ابھریں' جن کو آپ مزاحمتی قوتیں یا انقلاب مخالف قوتیں کہہ سکتے ہیں' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان تمام قوتوں سے پوری قوت کے ساتھ آہنی ہاتھ سے نبرد آزما ہوئے اور اس انقلاب کو جزیرہ نمائے عرب کی حد تک کامل طور پر مستحکم (consolidate) کر کے دنیا سے رخصت ہوئے۔ اس کے بعد خلافتِ راشدہ کا چوبیس سالہ دور ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ نوعِ انسانی پر محمد رسول اللہ ﷺ کی اصل حجت اُسی دور میں قائم ہوئی ہے' اس لیے کہ اس نظامِ عدلِ اجتماعی کی برکات کا ظہور خلافتِ راشدہ ہی میں ہوا ہے۔

دورِ فاروقیؓ و عثمانیؓ میں اسلام کی برکات کا ظہور

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ایک مسلسل جدوجہد اور ایک پیہم کشمکش ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اس جدوجہد کے دوران حالات و واقعات کی رفتار اتنی سریع اور اس کا tempo اتنا تیز تھا کہ واقعتاً ایک دفعہ تو انسان چکرا جاتا ہے۔ اس لیے کہ تاریخ انسانی میں یہ ایک ہی بار ہوا ہے کہ ایک انسانی عرصۂ حیات (lifespan) میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوا۔ فردِ واحد سے دعوت کا آغاز ہوا اور ایک وسیع و عریض خطے پر ایک نظام بالفعل قائم ہوگیا۔ کل بائیس برس میں دعوت، تنظیم اور تربیت کے مراحل بھی طے پا گئے، کشمکش بھی ہوگئی، ٹکراؤ اور مسلح تصادم بھی ہوگیا، فتح بھی ہوگئی، قیامِ امن بھی ہو گیا۔ اور یہ سب کچھ صرف بائیس برس میں ہوگیا! تو اب آپ خود سوچیے کہ حالات و واقعات کی تیز رفتاری کا کیا عالم ہوگا! اس کے بعد جو نظام پھر خلافت راشدہ میں قائم ہوا ہے، اس کا پورا کریڈٹ بھی آنحضور ﷺ کو جاتا ہے۔ آخر عمر رضی اللہ عنہ کون ہیں؟ عمر بن الخطاب کو عمر فاروق کس نے بنایا؟ یہ کس کی مسیحائی ہے؟ ظاہر ہے یہ نبی اکرم ﷺ ہی کی تربیت کا کرشمہ تھا۔ چنانچہ اس کا سارا کریڈٹ آپ ﷺ ہی کو جاتا ہے۔ جیسے ایک بند کلی ہو اور پھر وہ کھل کر پھول بن جائے، پھول میں پتیاں وہی ہیں جو کلی میں تھیں، کسی نئی پتی کا اضافہ نہیں ہوا، لیکن بہرحال وہ پھول کھلتا ہے تب پتیاں نمایاں ہوتی ہیں۔ کلی میں وہی پتیاں ہیں لیکن بند ہیں۔ تو بالقوۃ (potentially) وہ ساری برکات نبی اکرم ﷺ کے قائم کردہ نظام میں اوّل یوم سے موجود تھیں، لیکن ان کا جو ظہور ہوا ہے وہ دورِ خلافت حضرت عمر فاروق اور دورِ خلافت حضرت عثمان رضی اللہ عنہما میں ہوا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں بڑے بڑے مغالطے لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مَیں اس پر تفصیلی گفتگو تو بعد میں کروں گا، اِس وقت یہ ذہن میں رکھیے کہ خلافت راشدہ میں طویل ترین دورِ خلافت حضرت عثمانؓ کا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے اڑھائی سال، حضرت عمرؓ کے دس سال اور حضرت عثمانؓ کے بارہ سال ہیں۔

ان بارہ سال میں سے دس سال تو بالکل اسی شان کے ہیں جس شان کا دورِ فاروقی تھا۔ اختلاف' نزاع' فتنہ' یہ سب کچھ آخری دو سال میں ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں کے اذہان میں یہ نقشہ بٹھا دیا گیا ہے کہ شاید خیر و خوبی اور بھلائی صرف دورِ فاروقی میں تھی' دورِ عثمانی میں تو فتنہ و فساد اور اختلاف تھا۔ یہ ایک بہت بڑی تاریخی غلطی ہے' جس کا ازالہ کر دینا ضروری ہے۔ دس سالہ دورِ فاروقیؓ اور حضرت عثمانؓ کے پہلے دس سال ملا کر بیس سال بنتے ہیں۔ بیس سال کے اس عرصہ میں دو کام ہوئے۔ ایک تو غلبۂ دین' جس کا حکم نبی اکرم ﷺ کو لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کے الفاظ میں دیا گیا تھا۔ اس کو علامہ اقبال نے بڑے پیارے انداز میں بیان کیا ہے کہ: ؎

اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا!

شام فتح ہوا' ایران فتح ہوا' ترکستان کے علاقوں تک بات پہنچی ہوئی ہے' شمالی افریقہ تقریباً پورا فتح ہو چکا ہے' ایشیائے کوچک فتح ہو چکا ہے' صرف تھوڑا حصہ ''مدینۃ القیصر'' یعنی قسطنطنیہ بچا ہوا ہے۔ سلطنت روما کی تین ٹانگیں تھیں' جن میں سے دو ٹوٹ چکی تھیں۔ یہ تین براعظموں پر پھیلی ہوئی بہت بڑی سلطنت تھی' یعنی پورا شمالی افریقہ' پورا مغربی ایشیا' ایشیائے کوچک (Asia Minor) اور پھر نیچے شام اور اردن۔ اس کے کچھ مقبوضات یورپ میں بھی تھے' لیکن اب وہ سمٹ کر یورپ تک محدود ہو گئی' ذرا سی انگلی قسطنطنیہ پر ٹکی رہ گئی۔ رہی سلطنتِ کسریٰ تو اس کے تو وہ پرزے ہوئے کہ باید و شاید۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ کسریٰ نے میرا خط چاک نہیں کیا بلکہ اپنی سلطنت کے پُرزے کر دیے ہیں۔

یہ بات واضح رہے کہ فتوحات کے اس سیلاب میں کشور کشائی یا مالِ غنیمت کو مقصود کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

شہادت کے دو مطلب ہیں۔ ایک اللہ کی راہ میں قتل ہو جانا کہ مسلمان کا اس سے بڑا مقصد اور کوئی نہیں' یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک ہی تمنا ایسی ہے جو اللہ نے پوری نہیں کی۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ آنحضور ﷺ کی بھی کوئی تمنا اللہ تعالیٰ پوری نہ کرے! رسول اللہ ﷺ نے اپنی ایک شدید خواہش اور تمنا کا اظہار اِن الفاظ میں کیا تھا:

((لَوَدِدْتُ أَنِّیْ أُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ أُحْیَا ' ثُمَّ أُقْتَلُ ثُمَّ أُحْیَا ' ثُمَّ أُقْتَلُ ثُمَّ أُحْیَا ' ثُمَّ أُقْتَلُ)) (۱)

''میری بڑی آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر میں قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں''۔

لیکن آپؐ کی تمنا پوری نہیں کی گئی' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ایک اٹل قانون ہے کہ رسول کبھی قتل نہیں ہوتے۔ رسول نمائندہ ہے اللہ کا اور اللہ کی حکومت کا۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ؕ﴾ (المُجادلة: ۲۱) ''اللہ نے لکھ دیا ہے کہ لازماً میں اور میرے رسول غالب رہیں گے!'' رسول کہیں مغلوب ہونے کو آئے تو پوری کی پوری قوم کو تہس نہس کر دیا گیا' لیکن رسول مغلوب نہیں ہوا۔ اس لیے حضرت محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی یہ خواہش پوری نہیں کی گئی۔

شہادت کا ایک معنی تو مقتول فی سبیل اللہ ہونا ہے اور دوسرا اللہ کے دین کی اور توحید کی گواہی دینا ہے' جیسے اقبال نے کہا: ع

''دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی!''

یہ وہ گواہی ہے جس کو ادا کر کے آپ اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں: اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ یہ گواہی انفرادی طور پر بھی دی جاتی ہے اور اجتماعی طور پر بھی۔

(۱) صحیح البخاری' کتاب التمنی' باب ما جاء فی التمنی ومن تمنّی الشهادة' وکتاب الجهاد' باب تمنی الشهادة۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب فضل الجهاد والخروج فی سبیل الله۔

غیروں کی گواہی

بہرحال خلافتِ فاروقی وعثمانی میں ایک کام تو یہ ہوا کہ روئے ارضی کے ایک وسیع و عریض رقبے پر سے انسانوں کو بادشاہوں کے ظلم وجور سے نجات دلا کر عدلِ اسلام سے روشناس کرایا گیا اور غلامی کے جوئے ان کی گردن سے اتار دیے گئے۔ اس امر کی گواہی دوسروں نے بھی دی ہے۔ کسریٰ کا ایک ایلچی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملنے آیا۔ اس نے اہلِ مدینہ سے پوچھا کہ تمہارا بادشاہ کہاں ہے؟ جواب ملا: لَيْسَ لَنَا مَلِكٌ وَلَنَا اَمِيْرٌ کہ ہمارا کوئی بادشاہ نہیں ہے' ہمارا تو ایک امیر ہے۔ اس نے پوچھا: اچھا تو اس امیر کا قصرِ امارت کہاں ہے؟ جواب ملا: اس کا کوئی قصر امارت نہیں' وہ ابھی اس دروازے سے نکل کر مدینہ سے باہر گیا ہے۔ کسریٰ کا ایلچی اٹھا اور باہر جا کر دیکھا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک جھاڑی کے سائے میں اپنے کوڑے کو تکیہ بنائے ہوئے استراحت فرما رہے ہیں۔ جس عمر فاروقؓ کے نام سے قیصر وکسریٰ کے ایوانوں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے وہ یوں فرشِ زمین پر لیٹا ہوا ہے۔ ایلچی کچھ دیر دم بخود اس منظر کو دیکھتا رہا اور آخر پکار اٹھا کہ اے عمر! تم عدل وانصاف سے کام لیتے ہو' لہٰذا تمہیں کوئی ڈر نہیں' جبکہ ہمارے بادشاہ ظلم کرتے ہیں' لوگوں کا خون چوستے ہیں' لہٰذا ہر وقت کانپتے رہتے ہیں اور اسی لیے انہیں باڈی گارڈ بھی چاہئیں' اونچی اونچی فصیلوں والے محلات بھی چاہئیں' تحفظات بھی چاہئیں۔ یہ تھی وہ رائے جو سفیرِ کسریٰ نے اسلام کے نظامِ عدل اور اپنے ہاں کے نظامِ جور کے متعلق ظاہر کی۔

تو اتنے بڑے رقبے پر اسلام کو غلبہ حاصل ہوا۔ غلبہ اس معنی میں کہ نوعِ انسانی کی غلامی کی بیڑیاں کاٹ دی گئیں' غلامی کے طوق ان کی گردنوں سے اتار دیے گئے۔ ع

''تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے!''

کوئی حاکم نہیں' کوئی محکوم نہیں' کوئی مالک نہیں' کوئی مملوک نہیں! لوگوں سے صرف ایک مطالبہ ہے: كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا ''اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن

جاؤ!'' اس بات کو نوٹ کر لیجیے کہ انسانی اخوت و مساوات کا سب سے بڑا چارٹر اسلامی چارٹر ہے۔ اس کے آگے تنظیم اقوام متحدہ کے چارٹر کی کیا حیثیت ہے؟ حقوقِ انسانی کا سب سے بڑا منشور (Magna Carta) وہ خطبہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

((یَا اَیُّھَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ ' اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی اَعْجَمِیٍّ وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ وَلَا اَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی)) (مسند احمد)

''لوگو! آگاہ ہو جاؤ' یقیناً تمہارا ربّ ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ خبردار! نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر۔ اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر۔ فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے۔''

اس بات کو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بدترین دشمنوں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانی اخوت' مساوات اور حریت کے محض وعظ نہیں کہے بلکہ ان اصولوں پر فی الواقع ایک معاشرہ قائم کر کے دکھایا۔ کہا جاتا ہے کہ: اَلْفَضْلُ مَا شَھِدَتْ بِہِ الْاَعْدَاءُ ''اصل فضیلت وہ ہے جس کی گواہی دشمن دیں!'' چنانچہ ایچ جی ویلز (H.G.Wells) نے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ وہ بہت معروف شخصیت ہے اور سائنٹیفک فکشن میں اس کا بڑا اونچا مقام ہے۔ اس نے سائنسی خیالات پر مبنی کہانیاں لکھی ہیں۔ اس کا دوسرا کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخ کو بھی افسانوی انداز سے پیش کیا ہے۔ ایسے خوبصورت پیرائے میں تاریخ لکھی ہے کہ آدمی پڑھے تو ذہن بوجھل محسوس نہ ہو۔ اس کی دو کتابیں ''A Short History of the World'' اور ''A Concise History of the World'' بہت مشہور ہیں۔ اس کے بارے میں یہ بھی جان لیجیے کہ اس بدبخت نے رسول اللہ ﷺ کی ازدواجی زندگی پر بڑے رکیک حملے کیے ہیں' کیونکہ تعددِ ازواج کی کڑوی گولی عیسائیوں کے حلق سے کسی طرح نیچے نہیں

اترتی۔ اوّل تو اُن کے ہاں شادی کرنا ہی گھٹیا کام ہے' ان کی اپنی اقدار ہیں' تجرد کی زندگی بسر کرنا ان کے ہاں اونچے درجے کا کام ہے۔ شادی کرنا اور پھر متعدد شادیاں' یہ انہیں کسی طرح قبول نہیں۔ یہ شخص پیغمبر اسلام ﷺ سے اپنے تمام تر بغض وعناد کے باوجود اپنی کتاب میں پورا خطبۂ حجۃ الوداع نقل کرتا ہے اور پھر گھٹنے ٹیک کر یہ اعتراف کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے:

''اگرچہ انسانی اخوت' مساوات اور حریت کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے اور ایسے وعظ ہمیں مسیح ناصری کے ہاں بھی بہت ملتے ہیں' لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ محمد (ﷺ) ہی تھے جنہوں نے تاریخِ انسانی میں پہلی بار ان اصولوں پر ایک معاشرہ قائم کیا۔''

اس سے بڑا خراجِ تحسین اور ہو نہیں سکتا' اور پھر ایسے ذلیل شخص کی زبان سے جس کی نگاہوں سے آنحضور ﷺ کی ذاتی عظمت چھپی رہ گئی۔ لیکن وہ آپ ﷺ کے کارناموں کو کیسے جھٹلا سکتا ہے! اگرچہ اس کا تعصب اس کی آنکھوں کی پٹّی بن گیا اور آنحضور ﷺ کی شخصی عظمت کا وہ اندازہ نہ کر سکا' لیکن تاریخ کی ایک عظیم حقیقت کو جھٹلائے تو کیسے جھٹلائے؟ بہرحال اتنے وسیع وعریض رقبے پر اس نظام کو قائم کر دینا' جس میں ہر اعتبار سے عدل وقسط اور انصاف مکمل ہو' درحقیقت اسلام کا نوعِ انسانی پر ایک عظیم احسان تھا۔

نظامِ اجتماعی کے باہم متصادم پہلو

اب ایک بات سمجھ لیجیے کہ نظامِ اجتماعی کے متعدد پہلو ایسے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ متصادم (conflicting) ہوتے ہیں۔ انفرادی آزادی اور اجتماعی مصلحتیں باہم ٹکراتی ہیں۔ انسان کہتا ہے مجھے آزادی ہونی چاہیے' میں جو چاہوں کروں' جو چاہوں سوچوں' جو چاہوں زبان سے کہہ دوں۔ لیکن یہ شخصی آزادی اجتماعی اعتبار سے مضر ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں نقطۂ عدل یہ ہے کہ آزادی بھی مجروح نہ ہو اور اجتماعی مصلحتیں بھی پامال نہ ہوں۔ یہ بڑا کٹھن کام ہے' بہت مشکل معاملہ ہے۔ اسی طرح سب مانتے ہیں کہ

مساوات ہونی چاہیے۔ سو فیصد مساوات تو ظاہر ہے نہ کبھی دنیا میں ہوئی ہے نہ ہوگی اور نہ ہی فطرت کے مطابق ہے۔ کسی کو اللہ تعالیٰ نے سرخ و سپید رنگت دی ہے' کسی کا رنگ سیاہ کر دیا ہے۔ کسی کو یورپ میں پیدا کیا تو کسی کو افریقہ میں پیدا کر دیا' کسی کو ذہنی صلاحیتیں بہت دے دیں مگر جسمانی قوت نہیں دی۔ اس کے برعکس کوئی اگر چھ سات گھنٹے تک مسلسل کشتی چلا سکتا ہے تو اسے غور و فکر کی طاقت نہیں دی۔ تو یہ فرق و تفاوت تو ضرور رہے گا۔ لیکن بہر حال مساوات بھی مطلوب ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک کو تو کھا کھا کر ہیضہ ہو رہا ہے اور ایک نانِ شبینہ کا محتاج ہے۔ لیکن اس کی خاطر انسان کو اس طرح پابند کر دینا کہ آزادی بالکل ہی سلب ہو جائے' یہ بھی فطرت کے خلاف ہے۔ کیا کریں' بڑا مشکل معاملہ ہے! نوعِ انسانی انہی مسائل میں ٹھوکریں کھا رہی ہے' ایک بند کھولتے ہیں تو دوسرے کئی بندھنوں میں جکڑے جاتے ہیں۔ کبھی جاگیردارانہ نظام (Feudal System) پوری دنیا میں رائج تھا۔ سب سے اوپر بادشاہ ہے۔ بادشاہ کے نیچے barons ہیں' lords ہیں' پنج ہزاری' بیس ہزاری' تیس ہزاری منصب دار ہیں۔ ان کے علاقے ہیں اور وہ ان علاقوں کے مالک ہیں۔ رہنے والے سب ان کی رعیت ہیں۔ گویا غلامی در غلامی پر مبنی ایک نظام ہے۔

یورپ نے حقوق حاصل کرنے کے لیے بڑا زور مارا' بڑی قربانیاں دیں۔ بادشاہ اور جاگیردار Divine Rights of the King کے دعوے کے ساتھ مسلط تھے۔ اُن سے حقوق لینا کوئی آسان بات نہ تھی۔ بہر حال یہ آزادی حاصل ہوئی تو وہ ایسی غیر معتدل ہوگئی کہ روپیہ میرا ہے' میں اس سے جو چاہوں کروں' چاہے شراب خانہ کھولوں' چاہے قحبہ خانہ کھولوں' مجھے آزادی حاصل ہے' کسی کو روکنے کا حق نہیں ہے۔ روپیہ میرا ہے' مجھے آزادی حاصل ہے کہ اسے سود پر چلاؤں' اس پر قدغن کیسی؟ اس طرح اس آزادی نے سرمایہ داری کی لعنت کی شکل اختیار کر لی۔ جاگیرداروں سے نجات پائی تو سرمایہ دار مسلط ہو گئے کہ صاحب مجھے آزادی حاصل ہے' کارخانہ میرا ہے' میں تو یہی چند روپے مزدوری دوں گا' کسی کو کام کرنا ہے تو کرے' نہ کرنا ہو تو نہ کرے۔ کہنے کو مزدور بھی

آزاد ہے' مگر مزدور آزاد کہاں ہے؟ جب وسائل کا ارتکاز چند لوگوں کے پاس ہو گیا ہو تو وہ چند روپے روزانہ اجرت کے عوض کام کرنے پر مجبور ہے۔ کبھی آپ کے ہاں سوڈا واٹر کی بوتلیں چلتی تھیں' ہر گلی میں مشین لگی ہوئی تھی۔ کسی کے پاس تھوڑے سے پیسے ہوئے' اُس نے مشین لگالی اور بوتلیں بھر بھر کر بیچنے لگا۔ مگر پھر بڑے بڑے کارخانے لگ گئے اور وہ مشین غائب ہو گئی۔ ہر شخص کے لیے اس سطح کا کارخانہ لگانا ممکن نہیں جس سطح کا ایک سرمایہ دار لگائے گا۔ چنانچہ چھوٹی معیشت والوں کا دروازہ بند ہو گیا' اور زیادہ سے زیادہ لوگ مجبور ہو گئے کہ ان کارخانوں میں جا کر ملازمت کریں۔ بظاہر آزاد ہیں لیکن درحقیقت مجبور ہیں کہ معمولی اجرت پر کام کریں۔ یہ الگ بات ہے کہ جب یہ چیزیں انتہا کو پہنچ جاتی ہیں تو ان کا ردِّعمل ظاہر ہوتا ہے۔

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری!

ظلم ایک حد کو پہنچنے کے بعد ایک ردِّعمل کو جنم دیتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسی رنگ میں کچھ عرصہ تک سرمایہ داری مسلط رہی۔ پھر سرمایہ داری سے نجات حاصل کرنے کے لیے اشتراکیت کی ایک نئی تحریک چلی' جس کے نتیجے میں سوشلزم یا کمیونزم مسلط ہو گیا اور ایک پارٹی سٹیٹ قائم ہو گئی۔ یہ پارٹی اب بڑی جاگیردار (Big Land Lord) ہے' بڑی زمیندار ہے' بڑی سرمایہ دار ہے۔ چنانچہ آپ کی آزادی سلب ہو گئی' آپ جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ گئے۔

آزادی ومساوات کے بے مثال نمونے

اس پس منظر میں دیکھئے کہ جو نظام محمد رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا اور جس کی برکات کا ظہور خلافتِ راشدہ میں ہوا' وہ کیا تھا۔ آزادی کا یہ عالَم ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسجدِ نبویؐ میں خطبہ دے رہے ہیں۔ ایسے میں ایک مردِ درویش کھڑا ہو جاتا ہے اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے: ''لَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ'' یعنی نہ کوئی بات سنیں گے

اور نہ ہی اطاعت کریں گے! یہ کلمۂ بغاوت ہے۔ عمر فاروقؓ پوچھتے ہیں کیوں بھائی؟ وہ شخص جواب دیتا ہے کہ آپ نے جو کُرتہ پہن رکھا ہے وہ مالِ غنیمت کی چادروں سے بنا ہے۔ ہر مسلمان کو اس سے ایک ایک چادر ملی تھی، جس سے کُرتہ نہیں بنتا، آپ جیسے طویل القامت شخص کا اس سے کُرتہ کیسے بن گیا؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے خطبے میں فرمایا تھا: ''اگر میں سیدھا چلوں تو میری اطاعت تم پر واجب ہے، اور اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کرنا تم پر لازم ہے!'' تو یہ درویش بھی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا احتساب کر کے انہیں سیدھا کر رہا ہے۔

آپ غور کیجیے، بہترین سے بہترین جمہوری ملک میں بھی صدرِ مملکت، سربراہِ ریاست کو کتنا تحفظ دیا جاتا ہے! اس کو عدالت میں طلب نہیں کیا جا سکتا، اس کے ذاتی معاملات کو زیرِ بحث نہیں لایا جا سکتا، اور یہاں معاملہ صرف ایک معمولی کرتے کا ہے، اور اس پر بھی جواب طلبی ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم بتاؤ! انہوں نے کھڑے ہو کر وضاحت کی کہ مَیں نے اپنے حصے کا کپڑا ابھی ابا جان کو دے دیا تھا، کیونکہ ایک ایک چادر سے نہ میرا کرتا بن رہا تھا نہ ان کا۔ اس طرح ان کا کرتہ بن گیا۔ اس پر وہ درویش کہتا ہے کہ: اَلْآنَ نَسْمَعُ وَنُطِیْعُ! کہ ہاں، اب ہم سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے۔ حریت کا اس سے اونچا کوئی معاملہ انسان نے نہ کبھی پہلے دیکھا نہ اس کے بعد۔

ایران کے گورنر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ (فاتح ایران) نے اپنے گھر کے باہر ڈیوڑھی بنالی تھی اور آگے گیٹ لگا لیا تھا۔ آخر وہ گورنر ہے، اسے کوئی وقت آرام کے لیے بھی چاہیے، یہ تو نہیں کہ جو چاہے اور جب چاہے منہ اٹھائے اندر چلا جائے۔ لیکن جب یہ بات حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے علم میں آئی تو اس پر ان الفاظ میں شدید سرزنش فرمائی: مَتَی اسْتَعْبَدْتُمُ النَّاسَ وَقَدْ وَلَدَتْهُمْ اُمَّهَاتُهُمْ اَحْرَارًا؟ ''لوگوں کو تو اُن کی ماؤں نے آزاد جنا تھا، تم نے انہیں اپنا غلام کب سے بنالیا؟'' مدینہ سے اپنا قاصد روانہ فرمایا کہ اس گیٹ کو آگ لگا دے اور ڈیوڑھی کو مسمار کر دے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ آرڈی نینس جاری کرتے ہیں کہ عورتوں کا حق مہر چالیس اوقیہ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس پر ایک عورت اٹھتی ہے اور کہتی ہے کہ عمر! ہمارے جس حق کی کوئی حد نہ اللہ تعالیٰ نے قائم کی اور نہ اللہ کے رسولؐ نے' تم کون ہوتے ہو اُس کی حد مقرر کرنے والے؟ اور عمرؓ بلا تأمل کہتے ہیں کہ آج ایک بڑھیا نے عمر کو دین سکھایا ہے' اور آرڈی نینس واپس لے لیتے ہیں۔ یہ ہے آزادی! اگر آزادی کسی چڑیا کا نام ہے تو اس سے بڑی آزادی کا تصور ناممکن ہے۔

اس آزادی کے ساتھ اب آپ تصور کیجیے مساوات کا۔ وہ مساوات نہیں کہ آپ نے سو آدمیوں کو ایک رسّے سے باندھ دیا اور کہا کہ دوڑو' اور آپ خوش ہو گئے کہ اس طرح وہ دوڑ میں مساوی رہیں گے' نہ کوئی آگے ہوگا نہ پیچھے۔ نہیں' بلکہ وہ مساوات کہ دوڑنے کی بھی پوری آزادی ہے۔ چونکہ شخصی ملکیت ایک محرک (incentive) ہے' اس لیے اسلام میں اس کی پوری آزادی ہے' لیکن ظاہر ہے کہ اس دوڑ میں آگے پیچھے رہنے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔ اگر تو ایک رسّے سے سب کو باندھ دیا جائے تو نہ کوئی آگے رہے گا نہ پیچھے۔ مگر جب کھلا چھوڑیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی آگے آئے گا اور کوئی پیچھے۔ اسلام اس تفاوت کو تسلیم کرتا ہے' مگر اس کا نظامِ معاشیات ایسا عادلانہ ہے کہ اس میں ایک نسبت و تناسب طے ہے کہ آگے والوں سے کیا لیا جائے گا اور پیچھے رہنے والوں کی بنیادی ضروریات کی ضمانت دی گئی ہے کہ وہ بہرحال پوری کی جائیں گی۔ گویا ایک لکیر کھینچ دی گئی۔ چاہے تو جدید اصطلاح میں haves اور havenots کہہ لیجیے' چاہے فقیر اور غنی۔ فقیر کون ہے؟ جس کے پاس ساڑھے سات تولے سونا یا باون تولے چاندی موجود ہے وہ غنی ہے' اس سے زکوٰۃ لی جائے گی۔ اور جو اس لکیر سے نیچے رہ گیا ہے وہ فقیر ہے اور زکوٰۃ لینے کا حق دار ہے۔ زکوٰۃ کے بارے میں حدیث میں آیا ہے: ((تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ))(۱) ''ان کے مال

(۱) صحیح البخاری' کتاب الزکاۃ' باب وجوب الزکاۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الدعاء الی الشهادتین و شرائع الاسلام۔

داروں سے لی جائے گی اور ان کے فقراء میں لوٹا دی جائے گی۔''

دنیا میں اس وقت جو معاشرے ہیں ان میں انگریزوں کا معاشرہ بڑا منفرد (unique) ہے۔ ایک طرف تو روایت پرستی اس قوم کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ دوسری طرف ہر نئی چیز کے لیے آنکھیں اور کان کھلے بھی رکھتے ہیں۔ جو نئی بات آئے گی اس پر کھلے دل سے غور کریں گے' سوچیں گے اور اس میں جو اچھا پہلو ہوگا لے لیں گے۔ جیسے عربی میں کہا جاتا ہے: ''خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرَا'' مثلاً انسانیت نے بادشاہت سے جمہوریت تک کا جو سفر طے کیا ہے اس میں خون کسی اور نے دیا انقلاب کہیں اور آیا' خون کی ندیاں کہیں اور بہیں لیکن بہترین جمہوریت کون لے گیا؟ انگریز! اس کے باوجود وہاں بادشاہت بھی برقرار ہے۔ گویا روایت کی روایت بھی برقرار رہی اور جمہوریت کی جمہوریت بھی قائم ہوگئی۔ بالشویک انقلاب روس میں آیا' خون ریزی وہاں ہوئی' سوشلسٹ معیشت کا تجربہ وہاں ہوا' لیکن سوشلزم اور سرمایہ داری کا امتزاج ہو رہا ہے برطانیہ میں! گزارہ الاؤنس (subsistence allowance) برطانیہ میں دیا جا رہا ہے' لیکن ساتھ ہی آزادی بھی برقرار ہے۔ اگر آپ بے روزگار ہیں تو ریاست آپ کی بنیادی ضروریات کی ضمانت دے گی اور وہ آپ کو مہیا کرے گی۔

مستقبل کا نظریۂ حیات

یہ اصل میں وہ synthesis ہے جو اپنے آخری نقطۂ عروج پر محمد رسول اللہ ﷺ نے پیش کیا۔ انسان ٹھوکریں کھا کر' بڑی خونریزیوں کے بعد لامحالہ وہیں پہنچے گا' یہ تو ممکن ہی نہیں کہ کہیں اور جائے۔ یہی خیال ہے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کا' جس کا اظہار انہوں نے اپنی کتاب ''Ideology of the Future'' میں کیا ہے' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مستقبل کا نظریۂ حیات اسلام ہے۔ نوعِ انسانی چار و ناچار اُدھر جا رہی ہے' لیکن وہ ٹھوکریں کھا کر' دھکے کھا کر جائے گی' خونریزیوں کے بعد جائے گی' مختلف تجربے کرے گی اور ان تجربوں سے نمعلوم کتنا کچھ نقصان ہوگا۔ تاہم چار و ناچار وہیں پہنچے گی۔ بقول اقبال:۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

چین کے وزیراعظم کی بیٹی سائیکل پر سکول جاتی ہے تو اپنی جگہ یہ واقعی ایک قابلِ تعریف بات ہے۔ لیکن ذرا یہ بھی تو سوچو کہ دنیا کو اس مساوات سے کس نے آشنا کیا؟

کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟

حضرت عمرؓ کا سفرِ بیت المقدس

اب ذرا اس مساوات کو دیکھئے جس کی نظیر انسانی تاریخ نہ اب تک پیش کر سکی ہے اور نہ قیامت تک پیش کر سکتی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت ہے۔ مسلمانوں نے بیت المقدس کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ شہر کی فصیلیں بڑی مضبوط ہیں۔ شہر اپنی ضروریات میں خود کفیل ہے۔ اندر راشن اور پینے کا پانی وافر موجود ہے۔ اہلِ شہر کے لیے کوئی خاص دقت نہیں تھی، فصیلیں اور دروازے بند کیے بیٹھے ہیں۔ محاصرہ طول پکڑتا ہے تو ان کے پادری سفید جھنڈا لیے ہوئے فصیل پر آتے ہیں اور کہتے ہیں: مسلمانو! تم قیامت تک بھی یہاں پڑے رہو گے تو شہر فتح نہیں ہوگا۔ ہاں! ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ یہ شہر ایک درویش بادشاہ کے ہاتھوں فتح ہوگا۔ اس کے کچھ اوصاف اور کچھ علامات ہمارے ہاں لکھی ہوئی ہیں، تم میں ہمیں ویسا کوئی نظر نہیں آتا۔ یہ سن کر امیرِ جیش حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ بادشاہ تو عمرؓ ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے تشریف لانے کے لیے عرضداشت بھیجی گئی۔ اس پر آپؓ تشریف لائے۔ پادریوں نے کہا تھا کہ اگر وہ درویش بادشاہ خود آ جائے تو ہم اس کے لیے شہر کے دروازے کھول دیں گے اور شہر کا انتظام اس کے حوالے کر دیں گے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا سفرِ بیت المقدس کوئی ذاتی سفر نہ تھا بلکہ انتہائی اہم سرکاری دورہ تھا۔ مدینہ منورہ سے بیت المقدس سینکڑوں میل کا سفر ہے' لیکن اس سفر میں خلیفۂ وقت کے ہمراہ نہ کوئی لاؤ لشکر تھا' نہ خدم وحشم اور نہ کوئی سیکریٹری اور نہ باڈی گارڈ۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ صرف ایک غلام تھا اور سواری کے لیے ایک اونٹنی۔ اس عالم میں سفر ہو رہا ہے کہ ایک منزل عمرؓ اونٹنی پر سوار ہوتے ہیں اور نکیل غلام کے ہاتھ میں ہوتی ہے' جبکہ اگلی منزل میں غلام سوار ہوتا ہے اور عمرؓ مہار پکڑے پیدل چل رہے ہوتے ہیں۔ جب بیت المقدس میں داخل ہوتے ہیں تو غلام درخواست کرتا ہے کہ آپ اونٹنی پر سوار ہو جائیں' لیکن آپؓ فرماتے ہیں کہ نہیں' سوار ہونے کی باری تمہاری ہے۔ یہ ہے مساوات! یہ دنیا دس بار ختم ہو کر پھر پیدا ہو لے تو بھی اس مساوات کے آس پاس کی مثال بھی پیش نہیں کر سکتی۔ جس طرح حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا کوئی مثل ممکن نہیں ہے اسی طرح خلافتِ راشدہ کی بھی مثال ممکن نہیں ہے۔

ہمارا معیار اور آئیڈیل

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انتقال پر ایک بات کہی تھی کہ اے ابوبکرؓ! تم اپنے بعد آنے والوں کے لیے بڑی سختی پیدا کر گئے' ایسا معیار قائم کر گئے جس پر پورا اترنا آسان نہیں۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی وہ معیار قائم کیا جس کی نظیر ممکن نہیں۔ بہرحال ہمارا معیار اور آئیڈیل یہی نظام ہے جو یہ حضرات قائم کر گئے۔ یہ پریوں کی کہانیاں نہیں ہیں' یہ تاریخی حقائق ہیں۔ یہ نظام قائم ہوا ہے' بالفعل قائم ہوا ہے' دنیا کی شہادت ہے کہ قائم ہوا ہے۔ اس شہادت کی ایک صدائے بازگشت اس صدی کے آغاز میں مہاتما گاندھی کی زبان سے اُس وقت بلند ہوئی جب کانگرس کی صوبائی وزارتیں تشکیل پائی تھیں۔ اُس وقت مہاتما گاندھی نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ میں تمہارے سامنے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہما) کی مثال پیش کرتا ہوں۔ اس نے کسی اشوک' بکرماجیت' چندر گپت موریا اور رام چندر کی مثال پیش نہیں کی۔ مثال پیش کی تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی۔ یہ ہے میری گفتگو کا موضوع' جسے میں نے ع ''لذیذ بود حکایت

درازتر گفتم!'' کے مصداق شاید ذرا زیادہ پھیلا دیا۔ بہرحال یہ ہے اتمامِ حجت' یہ ہے بعثت انبیاء و رُسل علیہم السلام کی غرض و غایت اور یہ ہے محمد رسول اللہ ﷺ کی ختمِ نبوت کا تقاضا۔ ایک نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام کے لیے پوری انقلابی جدوجہد محمد رسول اللہ ﷺ نے کی اور پھر اس کے خلاف اٹھنے والی مزاحمتی اور مخالفانہ قوتوں سے خلیفۂ کامل' خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبرد آزما ہوئے اور بالکل ایک مستحکم معاشرہ دے کر رخصت ہوئے۔ اب اس کھیت میں جس میں ہل چل چکے تھے' کاشت کاری ہوئی' اور دورِ فاروقی و عثمانی میں نوعِ انسانی کے لیے نظامِ عدلِ اجتماعی کے عملی نمونے کی صورت میں ایک لہلہاتی فصل جملہ برکات کے ساتھ ظہور میں آئی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین○○

سلسلۂ خُطبات ⑦

انقلابِ نبویؐ کے خلاف تخریبی ردِّعمل
یعنی
’’الفِتنۃُ الکُبریٰ‘‘

آج کی نشست میں اپنی گفتگو کا آغاز مَیں نبی اکرم ﷺ کے اس فرمانِ مبارک سے کر رہا ہوں: ((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ))(۱) یعنی میں تو اخلاق کے محاسن کی تکمیل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ جہاں تک انفرادی اخلاق کا تعلق ہے وہ تو پہلے بھی بہت بلندی پر تھا۔ عفو و درگزر' احسان اور ایثار کی مثالیں سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات اور ان کی سیرت میں بھی ملتی ہیں۔ خود حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم تھی کہ: ’’دشمن سے محبت کرو' اپنے آپ کو جھٹلا دو' مگر دوسرے کو جھوٹا نہ کہو!‘‘ انہوں نے ایک شخص کو چوری کرتے ہوئے دیکھا اور پکڑ لیا تو اُس نے کہا مَیں چوری تو نہیں کر رہا تھا۔ آپؑ نے فرمایا: ’’ہاں بھئی! میری آنکھ نے غلط دیکھا ہوگا!‘‘ لیکن یہ انفرادی اخلاق تھا۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا کارنامہ یہ ہے کہ آپؐ نے انسانیت کو اجتماعی اخلاق دیے اور نظامِ اجتماعی کو اخلاق کی بنیاد پر قائم کیا۔ ذہن میں رکھیے کہ رسول اللہ ﷺ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ دینِ حق کو ایک کامل دین کی حیثیت سے قائم کر کے اور چلا کر دکھا دینا اور اس کی برکات کا ظہور اس طرح ہونا کہ پوری نوعِ انسانی اُن سے متمتع ہو۔ مَیں اس کے لیے یہ

(۱) مجمع الزوائد للھیثمی ۱۸/۹۔ لطائف المعارف لابن رجب : ۳۰۵۔ مختصر المقاصد للزرقانی : ۱۸۴۔ مسند احمد کی روایت میں ’’صالح الاخلاق‘‘ کا لفظ ہے۔

تشبیہ دیا کرتا ہوں کہ جیسے کوئی انسان ایک حسین خواب دیکھے اور پھر اُس کی یاد اُس کے ذہن میں محفوظ و برقرار رہے۔ نوعِ انسانی کی اجتماعی یادداشت (collective memory) میں خلافت راشدہ اس حسین خواب کے مانند ہے جو بنی نوعِ انسان نے کبھی دیکھا تھا کہ اس روئے ارضی پر ایک نظام ایسا بھی ہے' اور یہ ہے محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اصل اتمامِ حجت۔

لیکن اب آتا ہے اس کا انتہائی دردناک پہلو اور وہ ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کے آخری ایام میں ''الفِتنۃُ الکُبریٰ'' کا ظہور۔ اس کو بالکل سائنسی انداز سے (scientifically) سمجھ لیجیے کہ یہ فتنہ اصل میں کیا تھا۔ واقعات کی تفصیل میں آدمی گم سا ہو جاتا ہے' لیکن یاد رکھیے ایک ہے علمِ تاریخ اور ایک ہے فلسفۂ تاریخ۔ فلسفۂ تاریخ میں یہ تفصیلات نہیں ہوتیں کہ فلاں واقعہ کس دن اور کس تاریخ کو پیش آیا' بلکہ فلسفۂ تاریخ یہ ہے کہ واقعات کیوں ظہور پذیر ہوتے ہیں' اجتماعی حادثات کے اسباب کیا ہیں؟ تو اب سمجھئے کہ یہ فتنہ اصل میں کیا تھا۔ اس کے پس منظر میں یہ سمجھ لیجیے کہ انقلاب کے ساتھ ردّ انقلاب (counter revolution) یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اس کا فلسفہ میں بیان کر چکا ہوں۔ ایسا ہمیشہ ہوتا ہے کہ کسی انقلاب کے تکمیلی مراحل جب بالکل اپنی آخری حدود کو پہنچتے ہیں تو مخالف قوتیں اپنی جان بچانے کے لیے دبک جایا کرتی ہیں' اور منتظر رہتی ہیں کہ جب موقع ملے گا تو ہم انتقام لیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے عرب میں انقلاب مکمل فرمایا۔ اس کے خلاف جو تحریکیں اٹھیں اُن سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبرد آزما ہوئے۔ پھر خلافتِ فاروقیؓ و عثمانیؓ کے دوران بین الاقوامی سطح پر انقلابِ محمدی ﷺ کا جو سیلاب آیا اس کے متعلق یہ ذہن میں رکھیے کہ اس سلسلے میں کون کون سی زخم خوردہ (aggrieved) قوتیں تھیں جن کی کمر ٹوٹی اور کون کون سے گروہ تھے جنہوں نے زِک اٹھائی۔ یہ تجزیہ بڑا عجیب ہوگا' ذرا توجہ کو مرتکز کیجیے۔

جہاں تک شرک کا تعلق ہے' اُس کا تو قلع قمع ہو چکا تھا اور وہ بالکلیہ ختم ہو چکا تھا۔ باقی دو مذاہب تھے عیسائیت اور یہودیت۔ یہ دونوں وہ مذاہب تھے جن سے اسلام کا

براہِ راست تصادم ہوا' اور دو ہی سیاسی قوتیں' یعنی سلطنتِ روما اور سلطنتِ کسریٰ تھیں' جن سے اسلام کا تصادم ہوا۔ یہود و نصاریٰ میں سے نصاریٰ یعنی عیسائیوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں کوئی تصادم نہیں ہوا۔ جزیرہ نمائے عرب میں نجران وغیرہ کے مقامات پر جو عیسائی تھے انہوں نے معاہدہ کر لیا تھا۔ البتہ یہودیوں کا معاملہ دوسرا تھا۔ مَیں بیان کر چکا ہوں کہ مدینہ منورہ سے بنوقینقاع اور بنونضیر کو جلاوطن کیا گیا' جبکہ بنوقریظہ کے کئی سو افراد قتل ہوئے۔ خیبر یہود کا بڑا قلعہ تھا' وہ اُن کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ مذہبی سیادت اور چودھراہٹ ان کے ہاتھ سے جاتی رہی۔ لہٰذا مذہبی سطح پر یہودیت اسلام کی سب سے بڑی دشمن تھی۔ اب آپ الجبرے کے سوالات کی طرح درجہ بدرجہ چلتے ہوئے ایک نتیجہ نکال کر رکھ لیجیے۔ مَیں عرض کر چکا ہوں کہ سیاسی اور مملکتی سطح پر سلطنت روما کی تین ٹانگیں تھیں' خلافت راشدہ کے دوران ان میں سے دو ٹوٹ چکی تھیں' ایک برقرار تھی۔ تاہم اس کا نام نہیں مٹا تھا' وہ تو اُس وقت مٹا جب قسطنطنیہ فتح ہوا۔ لیکن سلطنت کسریٰ تو اس طرح نیست و نابود ہو گئی جیسے کہ اس کا وجود ہی نہ تھا۔ یہ وہ مملکت تھی جو پورے عرب کو اپنی جاگیر سمجھتی تھی' جس کے حکمران نے آنحضور ﷺ کو اپنی رعیت کا ایک فرد سمجھ کر آپؐ کی گرفتاری کا حکم دیا تھا۔ ذرا اُس کے طنطنے اور اس کے غرور کا تصور کیجیے — اور پھر یہ بھی تصور کیجیے کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔

انقلابِ نبویؐ پر ایرانی مجوسیت کا حملہ

فلسفۂ تاریخ کے اعتبار سے ایک اور بات بڑی اہم ہے کہ سلطنت روما ''ہر دیسی'' (cosmopolitan) تھی۔ اس میں بے شمار قومیتیں اور نسلیں آباد تھیں اور بے شمار زبانیں اُس میں بولی جاتی تھیں۔ کوئی ایک مرکزی تصورِ قومیت (Nationalism) اس کی پشت پر نہ تھا' جبکہ ایران میں ایک زبان' ایک کلچر' ایک تہذیب اور بہت حد تک ایک نسل تھی' اور اس طرح وہاں پر ایک بہت بڑا قومیتی جذبہ (Nationalist Sentiment) موجود تھا۔ یاد رہے کہ شاہِ ایران رضا شاہ پہلوی نے ایرانی بادشاہت کا اڑھائی ہزار سالہ جشن منا کر اپنی پرانی بنیادوں کو از سرِ نو زندہ اور تازہ کرنے کا جو عزم کیا

تھا اس کا رشتہ اُسی ایرانی قومیت سے جوڑا گیا تھا۔

''شاہنامۂ ایران'' کے خالق فردوسیؒ نے عربوں کے بارے میں جو اشعار کہے ہیں، وہ ایرانیوں کی ذہنیت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ دیکھئے اُس نے عربوں کے متعلق کس قدر نفرت اور استہزاء کا اظہار کیا ہے: ؎

زشیرِ شُتر خوردن و سُوسمار عرب را بجائے رسید است کار
کہ ملکِ کیاں را کُند آرزو تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو!

یعنی یہ اُونٹنیوں کا دودھ پینے والی اور سوسمار (گوہ) کھانے والی اُجڈ، گنوار اور وحشی عرب قوم، اُس کی یہ جرأت کہ عظمت و سلطنتِ کیانی حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگی!

یہی وہ مقام ہے جہاں سے انقلاب مخالف قوتیں اُبھری ہیں اور انتقام کا آغاز ہوا ہے، جس کا پہلا مظہر شہادتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہے۔ خلافتِ راشدہ پر پہلا وار ایران کی طرف سے ہوا جو بڑا بھرپور وار تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قاتل ابولؤلؤ فیروز مجوسی تھا جو جنگِ نہاوند میں گرفتار ہو کر غلام بنا اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے حصے میں آیا۔ اُس کا پشت پناہ ایک سابق ایرانی گورنر ہرمزان تھا۔ یہ ایک مکمل سازش تھی۔ ابولؤلؤ فیروز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کئی دن پہلے دھمکی دے گیا تھا۔ وہ بظاہر شکایت لے کر آیا تھا کہ مجھ پر میرے مالک مغیرہ بن شعبہ نے ٹیکس زیادہ مقرر کر رکھا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا کرتے ہو؟ کیا کیا فن جانتے ہو؟ اُس نے اپنے فنون گنوائے کہ مَیں فلاں کام بھی جانتا ہوں، فلاں کام کا بھی ماہر ہوں، چکّیاں بھی بناتا ہوں، ہتھیار بنانا بھی جانتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: پھر تو یہ رقم زیادہ نہیں۔ طیش میں آ کر جانے لگا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: اگر چکیاں بنانا جانتے ہو تو میرے لیے بھی ایک چکی بنا کر لانا۔ کہنے لگا: آپ کے لیے تو میں وہ چکّی بناؤں گا جسے دنیا یاد رکھے گی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ مجھے قتل کی دھمکی دے گیا ہے۔ لیکن وہاں اندیشہ نقص امن یا سیفٹی ایکٹ جیسے قوانین تو موجود نہیں تھے کہ فوراً گرفتار کر لیا جاتا۔ اسلام میں حریت ہے۔ جب تک کسی جرم کا ظہور نہ ہو سزا نہیں دی جا سکتی۔ محض گمان پر تو کوئی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ شہادتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے شاید ایک

ہی دن پہلے حضرت عمرؓ کے صاحبزادے نے دیکھا کہ ہرمزان اور ابولؤلؤ کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ جب دیکھا کہ کوئی آ رہا ہے تو گھبرا کر وہاں سے ہٹے۔ گھبراہٹ میں ایک خنجر بھی گرا جسے اُس نے اٹھا لیا۔ ہرمزان کے ساتھ اُس کی یہ ملاقات' گھبراہٹ اور خنجر' سارے قرائن پوری کہانی خود کہہ رہے ہیں' سارے شواہد موجود ہیں۔ پھر مسجد نبویؐ میں جس طرح یہ واقعہ پیش آیا اُس سے بھی پتا چلتا ہے کہ یہ یقینی طور پر ایک سازش تھی۔

یہ بات ذہن میں رکھیے کہ ایرانیوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اتنی دشمنی کیوں تھی۔ دشمنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بھی تھی' مگر اتنی نہیں۔ اس لیے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں شامِ کسریٰ کی فتوحات کا صرف آغاز ہوا تھا' جبکہ فرمانِ نبویؐ کے مطابق سلطنتِ کسریٰ کو پُرزے پُرزے کرنے والے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔ اس لیے ان کی اصل عداوت' دشمنی اور بغض اُن سے ہے۔ چنانچہ جو ذرا معتدل قسم کے لوگ ہوتے ہیں وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو معاف کر دیتے ہیں' لیکن جو چرکا انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں کھایا ہوا ہے اُس کو کیسے معاف کر دیں؟ اُن کے ہاں ابولؤلؤ فیروز کی تصاویر مقدس سمجھی جاتی ہیں اور اس طرح آویزاں کی جاتی ہیں جس طرح ائمۂ اہلِ بیت کی۔ یہ تاریخی حقیقت ہے' اس کو سامنے رکھیے۔ سمجھا یہ گیا تھا کہ شاید عمرؓ ہی بھاری پتھر ہیں' یہ ہٹ گئے تو معاملہ صاف ہو جائے گا۔ لیکن معلوم ہوا کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا انقلاب اتنا بودا نہیں تھا۔ اگرچہ عمرؓ ہٹ گئے' لیکن میدان صاف نہ ہوا۔

انقلابِ نبویؐ پر یہودیت کا حملہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دَورِ خلافت' جیسا کہ مَیں عرض کر چکا ہوں' پہلے دس سال تک اُسی دورِ فاروقی کی سی شان کا حامل رہا۔ لیکن اب اس پر یہود کی طرف سے بڑا زبردست وار ہوا۔ یہود نے اس کے لیے جو سازش تیار کی وہ اپنے نقطۂ عروج کو پہنچی ہوئی سازش ہے۔ دنیا گواہ ہے کہ یہودیوں کی سازشوں نے بڑی بڑی سلطنتیں اُلٹ کر رکھ دیں۔ علامہ اقبال کا مشاہدہ ہے کہ ع ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!'' ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا صدر ہر وقت خائف رہتا ہے کہ کہیں یہودی ناراض نہ ہو جائیں' ورنہ کوئی

نہ کوئی سکینڈل شروع ہو جائے گا۔ یمن کا ایک یہودی عبداللہ بن سبا اسلام کا لبادہ اوڑھ کر آیا اور اس نے اپنی سازش کا جال پوری سلطنت میں پھیلا دیا۔ تاریخ اپنے آپ کو دوہرا رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ پال (Paul) ساری عمر حضرت مسیح علیہ السلام کی مخالفت کرتا رہا' مگر پھر اُس نے ایسا داؤ کھیلا کہ عیسائیت کا لبادہ اوڑھ کر اس کی جڑ کاٹ دی۔ اُس نے توحید کی جڑ کاٹی' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو الوہیت میں شریک کر دیا اور اس طرح عیسائیت میں انسان پرستی کو داخل کر دیا۔ واقعۂ صلیب پر ایسی جذباتی فضا پیدا کی کہ دینِ حق کہیں کا کہیں رہ گیا اور عیسائیت کی بنیاد تثلیث اور مظلومیتِ مسیح پر قائم ہوگئی۔ یہ مثال اس لیے پیش کر دی گئی ہے کہ مبادا آپ کو یہ خیال ہو کہ ایک یہودی عبداللہ بن سبا اتنا بڑا کام کیونکر کر سکتا ہے؟ آپ دیکھ لیجیے' کیا پال اکیلا نہ تھا؟ مگر اس نے مسیحیت کا نقشہ ہی تبدیل کر دیا۔ معلوم ہوا کہ ایک غیر معمولی ذہنی صلاحیت رکھنے والا آدمی اکیلا ہی بہت کچھ کر سکتا ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن سبا نے اسلام کا لبادہ اوڑھا اور خلافتِ راشدہ کے خاتمے اور مسلمانوں کو باہم لڑانے کے منصوبے پر کام شروع کر دیا۔ کانا پھوسی کی ایک مہم شروع ہوگئی کہ حکومت وسلطنت تو آنحضور ﷺ کے خاندان' یعنی آپؐ کے اہلِ بیت' بیٹی کی نسل یا داماد کا حق تھا' یہ کسی اور کے پاس کیسے چلی گئی؟

قبائلی عصبیت کے بارے میں یاد رکھیے کہ یہ دورِ نبویؐ میں بالکل ختم نہیں ہوگئی تھی۔ چنانچہ ایسے واقعات موجود ہیں کہ کبھی انصار و مہاجرین کے درمیان تلواریں کھنچ جاتی تھیں اور کبھی اوس وخزرج کے درمیان۔ یہ تو آنحضور ﷺ کا وجودِ مسعود تھا جس کی وجہ سے بات آگے نہیں بڑھتی تھی۔ قبائلی عصبیت کی چنگاری دب تو گئی تھی مگر موجود ضرور تھی' اور سازشی ذہن کی ذہانت وفطانت یہی ہے کہ دیکھے کہ چنگاری کہاں دبی ہوئی ہے جسے پھونک مار کر بھڑکا دیا جائے۔ چنانچہ اس چیز کو اٹھانا تھا کہ کہانیاں کھڑی ہوگئیں' فلسفے جنم لینے لگے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ذاتی طور پر تہمتیں تراشی گئیں' قصے مشہور ہوگئے۔ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ دوسرے کے بارے میں اچھی بات مشکل سے مانتا ہے' مگر بری بات کو فوراً قبول کر لیتا ہے۔ جیسے آنحضور ﷺ کے زمانے میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ

صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بڑی گھٹیا تہمت لگی' اور قرآن گواہ ہے کہ بعض مؤمنین صادقین بھی اس میں ملوث ہو گئے۔ یہ انسان کی فطری کمزوریاں ہیں۔ بہرحال اب تو وقت کے دریا میں بہت سا پانی گزر چکا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کو لگ بھگ پچیس سال ہونے کو آئے تھے' رُبع صدی بیت گئی تھی' کبارِ صحابہؓ کی بڑی تعداد اُٹھ گئی تھی۔ چنانچہ اب تو افواہوں کے لیے پہلے کے مقابلے میں میدان کہیں زیادہ ہموار تھا۔ افواہوں کی مہم اس طرح چلائی گئی کہ اگر شام میں ہیں تو مصر کے گورنر کی برائی ہو رہی ہے' اور حجاز میں ہیں تو شام کے گورنر کی برائی ہو رہی ہے۔ اس طرح ہر جگہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی برائی ہو رہی ہے کہ انہوں نے گورنروں کی تقرری میں دیانت داری سے کام نہیں لیا۔ یہ ہے اصل بنیاد الفِتنة الکُبریٰ کی۔ یہ ہے وہ محرک جس نے تاریخِ اسلامی کے پہلے عظیم فتنے کی بنیاد ڈالی۔ اور یہ عجیب تاریخی حقیقت ہے کہ فتنہ پردازی کے لیے شیعانِ علیؓ کے نام کا لبادہ اوڑھا گیا اور اس کے لیے ایران کی زمین بہت زرخیز ثابت ہوئی۔

مَیں نے عرض کیا تھا کہ مذہب کی سطح پر انقلابِ نبوی ﷺ سے سب سے زیادہ متاثر اور زخم خوردہ (aggrieved) یہودیت تھی' سبائیت اسی کا شاخسانہ ہے۔ جبکہ مملکت کی سطح پر سب سے زیادہ زخم خوردہ ایرانی قوم تھی' جو بڑی نسل پرست قوم تھی۔ چنانچہ پہلا وار ایرانیوں نے کیا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے اور دوسرا وار یہودیت نے کیا' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہو گئی۔ اور پھر ان دونوں فتنوں نے ایک مشترکہ شکل اختیار کر لی' جس کا مرکز ایران بن گیا۔ اتفاقی طور پر نہیں' بلکہ یہاں اس کو سازگار ماحول مل گیا کہ اس کی جڑیں اس سرزمین میں نیچے اتر سکیں جہاں یہ دونوں رشتہ داریاں (affinities) جمع ہو سکیں۔

تاریخِ اسلام کی مظلوم ترین شہادت

مَیں نے اپنے کتابچے ''شہیدِ مظلومؓ'' میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے' کیونکہ شہادتِ عثمانؓ تاریخِ اسلامی کا سب سے زیادہ اندوہ ناک واقعہ ہے۔ غیروں نے حضرتِ عثمانؓ پر جو ظلم کیے اور ستم ڈھائے اُن کا تو مَیں ذکر نہیں کرنا چاہتا' حد یہ ہے کہ خود

اپنوں نے بھی ان پر بڑا ظلم کیا ہے اور ان پر اقرباء پروری اور بیت المال کے استعمال میں بے احتیاطی وغیرہ کے الزامات لگائے ہیں۔ یہ الزامات حضرت عثمان ذُوالنُّورین ؓ پر لگائے جا رہے ہیں جن کے عقد میں آنحضور ﷺ نے یکے بعد دیگرے اپنی دو بیٹیاں دیں اور فرمایا کہ اگر میری چالیس بیٹیاں ہوتیں تو بھی یکے بعد دیگرے عثمان ؓ کے نکاح میں دیتا چلا جاتا۔ یہ وہ عثمان ؓ ہیں جن کے متعلق آنحضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ''ہر شخص کا ایک رفیق ہوتا ہے اور عثمان ؓ میرا جنت کا رفیق ہے!'' جن کے بارے میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''فرشتے بھی عثمان سے حیا کرتے ہیں۔''

غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ حضرت عثمان ؓ کے نقد انفاق اور اونٹوں اور گھوڑوں کی صورت میں امداد پر اس قدر خوش ہوئے کہ اُن کی دی ہوئی اشرفیوں کو اچھالتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ ''اس کے بعد عثمان ؓ جو چاہے کرے اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا''۔ غزوۂ تبوک کا دوسرا نام جیشُ العُسرۃ ہے' اس لیے کہ ان دنوں مسلمانوں کی مالی حالت بہت پتلی تھی' دور دراز کا سفر درپیش تھا اور رومیوں جیسی طاقت کا سامنا تھا۔ آپ ﷺ نے انفاق کے لیے اپیل کی۔ پہلے حضرت عثمان ؓ نے سو اونٹ مع ساز و سامان پیش کیے' آنحضور ﷺ خوش ہو گئے' مگر اپیل جاری رہی۔ حضرت عثمان ؓ ہر بار سو اونٹ پورے ساز و سامان سمیت دیتے چلے گئے تا آنکہ اونٹوں کی تعداد تین سو تک پہنچ گئی۔ اس کے باوجود اپیل جاری رہی۔ اس پر حضرت عثمان ؓ نے ایک ہزار اشرفیاں لا کر آنحضور ﷺ کے سامنے ڈھیر کر دیں۔ روایات میں آتا ہے کہ آنحضور ﷺ کا چہرہ فرطِ مسرت سے اس طرح سرخ ہو گیا جیسے کسی نے آپؐ کے رخساروں پر انار نچوڑ دیے ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے اللہ! میں عثمان ؓ سے راضی ہوں' تو بھی اُس سے راضی ہو جا!'' وہ عثمان ؓ جو کامل الحیاء والایمان ہیں اُن پر ایسی تہمت! انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت عثمان ؓ کے بارے میں بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ کمزور تھے۔ میرے نزدیک اس سے زیادہ بوالعجبی کوئی ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کمزور آدمی کو غصہ بہت جلد آتا ہے' جبکہ وہ انسان قوی ہوتا ہے جسے غصہ نہیں آتا۔ آنحضور ﷺ کا

ارشاد ہے:

((لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ، اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِيْ يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ)) (۲)

''پہلوان وہ نہیں جو کشتی میں کسی کو پچھاڑ دے' پہلوان تو وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھ سکے!''

کمزور آدمی کے ہاتھ میں اگر طاقت آ جائے تو وہ کیا کچھ نہ کرے گا؟ اور یہاں معاملہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ ہے' ایک دو دن کی بات نہیں' پچاس دن کا محاصرہ ہے۔ پانی تک بند ہو چکا ہے۔ وہ بئر رومہ جو حضرت عثمانؓ نے ذاتی طور پر خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کیا تھا' اُس کا پانی خود اُن پر بند ہے۔ وہ کنواں یہودیوں کی ملکیت تھا اور مسلمانوں کو پانی حاصل کرنے میں بڑی دقت تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے منہ مانگے دام دے کر اسے خریدا اور وقف کر دیا تھا۔ محاصرے کی شدت کا یہ عالم تھا کہ حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کی کچھ امانتیں حضرت عثمانؓ کے پاس تھیں' وہ انہیں واپس لینے کے لیے جانے لگیں تو ساتھ ایک مشکیزہ پانی کا بھی لے لیا' مگر بلوائیوں نے اس مشکیزے میں بھی چھید کر دیے اور پانی بہا دیا۔ اُمّ المؤمنین حضرت اُم حبیبہؓ کی بے عزتی بھی کی گئی۔ ان حالات میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک فیصلہ کر کے اس پر ڈٹے ہوئے ہیں ـــــ اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ میں اپنی حفاظت میں کسی کلمہ گو مسلمان کا خون نہیں بہاؤں گا۔ کیا کوئی کمزور آدمی اس طرح ڈٹ سکتا ہے؟ ذرا سوچیے' اس کے لیے کیسی عزیمت اور کیسی پختہ قوتِ ارادی درکار ہے!

پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اُس وقت کیسی وسیع و عریض مملکت کے فرمانروا تھے۔ قرآن مجید میں ذوالقرنین کا ذکر بڑی شان و شوکت کے ساتھ آیا ہے۔ مطلع الشمس اور مغرب الشمس تک اُن کی مہم جوئی کا ذکر ہے۔ اس کے باوجود اُن کی

(۲) صحيح البخاري' كتاب الادب' باب الحذر من الغضب۔ وصحيح مسلم' كتاب البر والصلة والآداب' باب فضل من يملك نفسه عند الغضب وبای شیءٍ يذهب۔

حدودِ مملکت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مملکت کے ایک تہائی سے زیادہ نہیں تھی۔ پھر آپؓ کے گورنر اور جرنیل بھی بڑے مدبر اور شان وشوکت والے ہیں۔ شام میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور مصر میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ آپؓ کے ماتحت ہیں اور لجاجت و اصرار سے کہہ رہے ہیں کہ آپ ہمیں ان بلوائیوں سے دودو ہاتھ کرنے کی اجازت دیں۔ مسلمانوں کی فوج اب ہزاروں سے متجاوز ہوکر لاکھوں تک پہنچ چکی تھی' جبکہ بلوائی صرف چند ہزار تھے' آپؓ فوج کشی کا اشارہ بھی کر دیتے تو ان بلوائیوں کی تکا بوٹی ہوجاتی' مگر نہیں! آپؓ کا موقف یہ تھا کہ بلوائی اپنی تمام تر شرارتوں کے باوجود بظاہر کلمہ گو ہیں اور محمد رسول اللہ ﷺ کا قانون ہے کہ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ڈھال ہے' جس پر کسی کلمہ گو مسلمان کی تلوار نہیں اُٹھ سکتی۔ یہ ڈھال کسی نے سچی اٹھائی ہے یا جھوٹی اٹھائی ہے' اس کا فیصلہ دنیا میں نہیں کیا جاسکتا' یہ صرف اللہ ہی کو معلوم ہے۔ ایک جنگ میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے ایک کافر پر تلوار اٹھائی' اُس نے فوراً کلمہ پڑھ دیا' مگر اٹھی ہوئی تلوار رک نہ سکی' وہ قتل ہوگیا۔ غالب خیال یہی تھا کہ اُس نے جان بچانے کے لیے جھوٹ موٹ کلمہ پڑھا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کو علم ہوا تو آپؐ نے سخت سرزنش فرمائی اور کہا اُس وقت کیا کرو گے جب قیامت کے دن اُس شخص کا کلمہ تمہارے خلاف استغاثہ لے کر آئے گا کہ میرے ہوتے ہوئے اسے قتل کر دیا؟ تو کلمہ کی یہی ڈھال بلوائیوں کے پاس تھی۔ حضرت عثمانؓ نے اس پر وار نہیں کیا' سارے وار اپنی ذات پر لے لیے کہ میرا خون تمہیں مطلوب ہے تو حاضر ہے' میں اپنی مدافعت میں کسی کلمہ گو کا خون نہیں بہاؤں گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بار بار کہہ رہے ہیں کہ اجازت دیجیے۔ انصار کی طرف سے ترجمان بن کر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ آئے ہیں کہ ہمیں دوبارہ اللہ کا مددگار بننے کا موقع دیجیے' ہم نے اللہ کے رسولؐ کی مدد کی تھی اور اب خلیفۂ رسولؐ کی مدد کرنا چاہتے ہیں' اجازت دیجیے۔ مگر ادھر سے ایک ہی جواب ملتا ہے کہ: ''اَمَّا الْقِتَالَ فَلَا!'' یعنی جنگ کی تو اجازت نہیں! ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کمزور انسان تھے؟؟

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ایمان لانے سے پہلے بہت بڑے یہودی عالم تھے۔ وہ آئے اور محاصرہ کرنے والے بلوائیوں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اجازت مانگی' کیونکہ انہیں بھی کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ بلوائی خوش ہوئے' سمجھے کہ اپنا ہی آدمی ہے۔ کہا کہ اچھا جاؤ' مل لو۔ چنانچہ یہ گئے' گفتگو ہوئی' جس کے نتیجے میں سارے شکوک وشبہات ختم ہوگئے اور حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی۔ اب انہوں نے واپس آکر ہجوم کے سامنے ایک خطبہ دیا کہ اے لوگو! مَیں نے اللہ کی کتاب تورات پڑھی ہے' اس میں ایک بات لکھی ہے' جس کے حوالے سے مَیں تمہیں خبردار کر رہا ہوں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نبی کو قتل کیا گیا ہو اور اُس کے بعد ستر ہزار انسان قتل نہ ہوئے ہوں اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نبی کے خلیفۂ برحق کو قتل کیا گیا ہو اور اس کے بعد کم از کم ۳۵ ہزار انسان قتل نہ ہوئے ہوں! لہٰذا باز آجاؤ اور خونِ عثمانؓ اپنی گردن پر نہ لو! —— اللہ کی نگاہوں میں یہ قیمت ہے نبی اور اس کے خلیفہ کی! چنانچہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل کے بعد یہودیوں پر ٹائٹس رومی کو مسلط کیا گیا تھا' جس کی افواج کے ہاتھوں ایک لاکھ تیس ہزار یہودی قتل ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے بلوائیوں کو خلیفۂ رسولؐ کے قتل کے ہولناک انجام سے خبردار کر کے انہیں ان کے اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی' لیکن انہوں نے آپؓ کی ایک نہیں سنی اور کہا کہ یہ بڈھا یہودی پاگل ہوگیا ہے' اسے نکالو۔ یہ عالم تھا اُس وقت مخالفت کا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے خون کے ان پیاسوں کو خطاب کیا اور فرمایا: مسلمانو! مَیں نے جس دن سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی ہے' اس کے بعد میری زندگی میں کوئی جمعہ ایسا نہیں گزرا کہ مَیں نے ایک غلام کو آزاد نہ کیا ہو۔ اور اگر کسی جمعہ کو ایسا نہ کر سکا تو اگلے جمعہ کو اس کا فدیہ دیا اور ایک کی بجائے دو غلام خرید کر آزاد کیے۔ میرے احترامِ رسالت کا یہ عالَم ہے کہ جو ہاتھ مَیں نے بیعت کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں دیا تھا اسے کبھی اپنی شرمگاہ کو نہیں لگایا۔ مگر ان لوگوں کے کانوں پر پردے پڑے تھے' ہر صدا اُن سے ٹکرا کر واپس آجاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر بلوائی آپؓ کے

مکان میں داخل ہو گئے اور آپؓ کو شہید کر دیا۔ شہادت کے وقت آپؓ قرآن حکیم کی تلاوت کر رہے تھے۔ یہ ہے اصل مظلومیت کی شہادت۔ پچاس دن کا محاصرہ کوئی معمولی بات نہیں، جس کے دوران پانی تک بند کر دیا گیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اس مظلومانہ شہادت پر پردے ڈالنے کے لیے ایک طبقہ کی طرف سے کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آپؓ کے خانوادے کی پیاس کے بارے میں مبالغہ آمیز داستانیں گھڑی گئیں۔ مشہور روایات کے مطابق حضرت حسین رضی اللہ عنہ ۲ محرم الحرام کو میدانِ کربلا میں پہنچے تھے اور ۱۰ محرم کو ان کی شہادت ہو گئی۔ یعنی زیادہ سے زیادہ چار دن پانی بند رہا۔ پھر حضرت حسینؓ کا قافلہ دریائے فرات سے کچھ ہی فاصلے پر مقیم تھا، جہاں تھوڑا سا گڑھا کھودا جائے تو پانی برآمد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ گڑھے کھودے گئے اور گدلا پانی فراہم کیا گیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ یقیناً آسمانِ نبوت کا ایک درخشاں ستارہ ہیں اور ان کی شہادت ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ لیکن نسبت و تناسب تو دیکھیے۔ ایک شخص میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے قتل ہوا ہے، اس کے ہاتھ میں تلوار ہے اور وہ ''فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ'' کا مصداق ہے۔ چنانچہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے، جس کا نقشہ ہمارے مرثیہ نگاروں نے خوب کھینچا ہے:

''کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رُستم کا بدن زیرِ کفن کانپ رہا ہے!''

پھر یہ کہ اُس وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس حکومت نہیں تھی۔ اور یہاں جیسا کہ مَیں عرض کر چکا ہوں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اتنی بڑی سلطنت کے فرماں روا ہیں جو ذوالقرنین کی مملکت سے تین گنا بڑی ہے۔ شمالی افریقہ کے مغربی ساحل سے بلخ و بخارا تک آپؓ کی سلطنت کی حدود ہیں۔ آپؓ کے ایک اشارے پر لاکھوں کی تعداد میں فوجیں حرکت میں آ سکتی ہیں، اس کے باوجود آپ کس مظلومیت کے ساتھ قتل ہوئے ہیں کہ کسی کلمہ گو کے قتل کا داغ اپنی گردن پر لے کر رخصت نہیں ہوئے۔ کوئی باہم نسبت

ہے؟ لیکن اہل سنت میں سے بھی اس شہادت کے جاننے والے کتنے ہیں؟ تاریخ اسلام میں ایک سے ایک بڑھ کر شہادت ہے۔ حضرت حمزہ ؓ کی شہادت کچھ کم ہے؟ وہ اسداللہ واسد رسولہ ہیں۔ پھر حضرت یاسر ؓ اور حضرت سمیہ ؓ کی شہادت کیا کم ہے؟ یہ وہ پہلا خون ہے جو اللہ کی راہ میں بہایا گیا۔ تو یہ سب شہادتیں چمن نبویؐ کے پھول ہیں' ایک سے ایک اعلیٰ' ایک سے ایک عمدہ۔ حق کی گواہی' صداقت کی گواہی' عدل کی گواہی' خیر کی گواہی' دین کی گواہی' قرآن کی گواہی' محمد رسول اللہ ﷺ کی گواہی میں گردنیں کٹوانا اِس اُمت کا مقصدِ وجود ہے۔ اس کو ایک کہانی اور افسانہ بنا دینا اور سارے دین کو اس کے گرد چکر دے دینا' اس کے گرد انسان پرستی کے ہالے بُن دینا یہودیت کا کام ہے اور یہودیت ہمیشہ سازشوں کو پروان چڑھاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو خدا کہنے والا کوئی آج تک پیدا نہیں ہوا' لیکن حضرت علی ؓ کو خدا کہنے والے دنیا میں موجود ہیں۔ کیونکہ اس کے پیچھے کوئی ذہن کارفرما ہے۔ وہی عیسائیوں والی تثلیث یہاں بھی آ گئی۔ حضرت مریم کی جگہ حضرت فاطمہ ؓ کو دے دی گئی اور اس طرح تثلیث مکمل ہو گئی۔

جس روز حضرت عثمان ؓ کی شہادت ہوئی ہے' اُن کی ملکیت میں بیس غلام تھے۔ آپؓ نے ان کو بلا کر کہا کہ تم سب آزاد ہو۔ آپؓ نے ساری عمر کبھی شلوار نہیں پہنی تھی' اب شلوار منگوا کر زیبِ تن فرمائی' مبادا شہادت کے وقت ستر کھل جائے۔ حیا کا یہ عالم تھا! پھر اس شلوار کو کس کر باندھا اور اس طرح شہید ہونے کے لیے پوری طرح تیار ہو گئے۔ ایسا نہیں ہوا کہ اچانک حادثہ ہو گیا ہو۔ روزہ رکھا ہوا ہے' قرآن مجید پڑھ رہے ہیں' سورۃ البقرۃ میں فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ پر پہنچے تھے کہ شہید کر دیے گئے اور آپؓ کا خون ان الفاظ پر گرا۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے جو فرمایا تھا وہ سچ ثابت ہوا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد چوراسی ہزار مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں' نیزوں اور تیروں کا شکار ہوئے۔ حضرت علی ؓ کا پورا عہدِ خلافت خانہ جنگی کی نذر ہو گیا!!

حضرت عثمان ؓ کی شہادت کے بعد حضرت علی ؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت

حسن رضی اللہ عنہ نے اپنا خواب بیان کیا کہ مَیں کیا دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر متمکّن ہیں۔ نبی اکرم ﷺ تشریف لاتے ہیں اور عرش کا ایک پایہ تھام کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آتے ہیں اور آنحضور ﷺ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ آتے ہیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر اچانک حضرت عثمان ذُوالنُّورین رضی اللہ عنہ اس حال میں حاضر ہوتے ہیں کہ اُن کا کٹا ہوا سر اُن کے ہاتھوں میں ہے اور وہ فریاد کرتے ہوئے آتے ہیں کہ اے اللہ! اپنے رسولؐ کی اُمت سے پوچھ کہ انہوں نے کس جرم کی پاداش میں مجھے شہید کیا؟ اس پر عرشِ الٰہی تھراتا ہے اور زمین کی طرف خون کے دو پرنالے جاری ہو جاتے ہیں۔ خون کے یہ دو پرنالے جنگِ صِفّین اور جنگِ جَمل ہیں جن میں مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کا خون بہا۔

نتیجہ کیا نکلا؟ اس کو اس تناظر میں سمجھئے جسے علامہ اقبال مرحوم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ: ع ''تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا!'' اب وہ سیلِ رواں تھم گیا۔ کوئی بیرونی قوت اسے روکنے والی نہ تھی' اسے اندرونی خلفشار نے روکا۔ باہر سے کون روک سکتا تھا؟ سلطنتِ روما کی ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں' سلطنتِ کسریٰ نیست و نابود ہو چکی تھی۔ اب اور کون سی طاقت رہ گئی تھی جو اس کے راستے میں مزاحم ہو سکتی؟ یہودیت کی سازش کے نتیجے میں ایسا اندرونی خلفشار پیدا ہوا جس نے اس بڑھتے ہوئے سیلِ رواں کو ایسا روکا کہ وہ آج تک رکا ہوا ہے۔ اس کے بعد کی تاریخ ''تاریخِ اسلام'' نہیں ہے' بلکہ مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ خلافت راشدہ' جو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تھی' جو اللہ کے آخری رسول ﷺ کے مشن کی عالمی سطح پر تکمیل کی امین تھی' ختم ہو گئی۔ اگرچہ ہماری تاریخ کا یہ دَور بھی ایسا نہیں ہے کہ ہم اس پر بہت زیادہ شرمندہ ہوں۔ اس دور میں بھی مسلمانوں نے بڑی اعلیٰ حکومتیں قائم کیں' بڑے اعلیٰ حکمران پیدا کیے۔ تہذیب بھی ہے' تمدن بھی ہے' علوم بھی ہیں' فنون بھی ہیں' بہت اعلیٰ دَور ہے' جس میں مملکتوں کے مقابلے میں مملکت' سلطنتوں کے مقابلے میں سلطنت' بادشاہوں کے مقابلے میں بادشاہ نظر آتے

ہیں۔ اس اعتبار سے بھی تقابل کیجیے تو اس کی بھی نظیر آپ کو نہیں ملے گی' لیکن جو چیز ختم ہوگئی وہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہے کہ وہ نظام برپا ہی اس مقصد کے لیے ہوا تھا کہ پیغامِ رسالتِ محمدی ﷺ کو دنیا تک پہنچانا ہے۔ یہ ہے خلافتِ راشدہ کی اصل غرض و غایت اور اس کا مشن۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت: خلافتِ راشدہ کا خاتمہ؟

خلافت راشدہ کہاں ختم ہوئی؟ یہ ایک تاریخی مسئلہ ہے' جس میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تیس سال تک خلافتِ راشدہ کا عرصہ ہے۔ اس کو سامنے رکھیے تو حضرت حسنؓ کی خلافت کے خاتمے پر وہ وقت ختم ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے خلفائے راشدین پانچ ہوئے: حضرت ابوبکرؓ' حضرت عمرؓ' حضرتِ عثمانؓ' حضرت علی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہم۔ لیکن صحاحِ ستہ ہی میں ایک اور روایت بھی ملتی ہے جس میں بارہ خلفاء کا ذکر ہے اور ان کے متعلق کہا گیا کہ یہ سب قریش میں سے ہوں گے۔ یعنی یہ امر بارہ خلفاء تک جاری رہے گا۔ جو لوگ اس تعداد کا اعتبار کرتے ہیں وہ خلافتِ راشدہ کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تک لے جاتے ہیں۔ اس دَور میں خلفائے اربعہ کے علاوہ نہ صرف حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ شامل ہوتے ہیں بلکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز تک بنواُمیہ کا پورا ابتدائی دور بھی آ جاتا ہے۔

اس ضمن میں امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے جو بات کہی ہے وہ میرے نزدیک سب سے زیادہ وقیع اور مدلّل ہے۔ شاہ صاحب کی رائے کے مطابق خلیفہ کی اپنی ذات اور اُس نظام کو جو قائم ہے' دونوں کو جدا جدا کر کے دیکھنا پڑے گا۔ اپنی ذات کے اعتبار سے تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی صحابی ہیں' ان کے بارے میں کسی کو اگر بدنیتی کا کوئی شائبہ ہے تو اس کا ایمان سلامت نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ یا حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے متعلق جسے بدنیتی کا شبہ ہے وہ بھی اپنے ایمان کی خیر منائے۔ البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یقیناً ان حضرات سے افضل ہیں۔ ہمارے نزدیک بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ تین افراد کے سوا پوری اُمتِ مسلمہ میں افضل ترین انسان

ہیں۔ خلفاءِ ثلاثہ حضراتِ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ پوری اُمت میں افضل ترین انسان ہیں۔ اہلِ سُنّت میں کوئی شخص آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو امیر معاویہؓ کو حضرت علیؓ سے افضل سمجھتا ہو۔ ایسا نقطۂ نظر قرآنی نصوص کے خلاف ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۰﴾ (الحدید)

''نہیں برابر تم میں سے وہ شخص کہ جس نے خرچ کیا تھا فتح مکہ سے پہلے اور لڑائی کی تھی۔ یہ لوگ بڑے ہیں درجوں میں ان لوگوں سے جنہوں نے خرچ کیا اس کے بعد اور لڑائی کی، اور ہر ایک کو وعدہ دیا ہے اللہ نے اچھا، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

تو جب ان دونوں چیزوں یعنی خلیفۂ راشد کی ذات اور اُس کے عہد میں قائم نظام کو جدا کریں گے تو ایک عجیب بات سامنے آتی ہے کہ خلافتِ راشدہ ختم ہوگئی شہادتِ حضرت عثمانؓ پر۔ اُن کے بعد خلیفۂ راشد حضرت علیؓ کی خلافت کا ساڑھے چار سالہ دَور باہمی خانہ جنگی کا دَور ہے، اس کے دوران محمدی مشن میں کوئی اضافہ نہیں ہوا، ایک انچ زمین بھی حدودِ بلادِ اسلامیہ میں شامل نہیں ہوئی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔

دوسری بڑی حقیقت جس کو شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بیان کیا ہے، یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کی اوّلین خصوصیت اُمت مسلمہ کا مجتمع رہنا ہے۔ مگر حضرت علیؓ کے پورے دورِ خلافت میں اُمت یکجا نہ ہوسکی، باہم بٹی رہی۔ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ نے ان کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ اس طرح ایک بڑا علاقہ اور پورے کے پورے ممالک ان کی بیعت سے خالی رہے۔ تو یہ جو اُمت کا جمع ہوجانا ہے وہ خصوصیت بھی حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں موجود نہیں۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مطابق حضرت علیؓ اپنی ذات میں تو بلاشبہ خلیفۂ راشد ہیں، لیکن ان کا دورِ حکومت خلافتِ راشدہ

میں شامل نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کا کوئی الزام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات پر نہیں ہے۔ ایک خاص طبقے کے ردِّعمل کے طور پر ہمارے ہاں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں کچھ لوگوں کو حضرت علیؓ سے بغض ہو گیا ہے۔ یہ صورت حال بہت خطرناک ہے۔ یہ بھی سبائی سازش کا شاخسانہ ہے۔ یہ دو دھاری تلوار ہے۔ مسلمان اگر حضرت عثمانؓ کے بارے میں بدظن ہوں تو بھی ان کے پو بارہ ہیں اور اگر حضرت علیؓ سے بدظن ہوں تو بھی ان کی سازش کامیاب ہے' انہیں کوئی گھاٹا نہیں۔ گھاٹا دونوں اعتبارات سے اُمتِ مسلمہ کا ہے۔ حقیقت میں وہ بھی اُمتِ مسلمہ کے گلِ سرسبد ہیں اور یہ بھی۔ وہ بھی تربیتِ محمدیؐ کے شاہکار ہیں اور یہ بھی تعلیم و تزکیۂ محمدیؐ کے شاہکار ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی مجروح کرتے ہو تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تربیت پر حرف آتا ہے۔

مناقشاتِ صحابہؓ کے بارے میں معتدل رائے

اس ضمن میں معتدل رائے یہی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین جو مناقشات ہوئے ان میں کسی کی بدنیتی کا کوئی دخل نہیں۔ صرف غیروں کا ڈالا ہوا پیچ تھا جو اِس عیاری کے ساتھ ڈالا گیا کہ انتہائی خلوص کے باوجود حل نہیں ہوا۔ لیکن الزام نہ حضرت عثمانؓ پر آتا ہے' نہ حضرت علیؓ پر' نہ حضرت معاویہؓ پر' نہ حضرت عمرو بن العاصؓ پر اور نہ حضرت عائشہ صدیقہؓ پر' کیونکہ ''اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ!'' پیچیدگیاں واقعتاً پڑی ہیں مگر ڈالی اغیار نے ہیں' اور اس طرح ڈالی ہیں کہ ان کا حل ممکن نہ ہوا۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے باہمی اختلاف کے بارے میں اہل سنت کا تقریباً اجماع ہے کہ غلطی حضرت معاویہؓ کی تھی' لیکن غلطی اور شے ہے' بدنیتی اور شے ہے' ان دونوں کو ایک دوسرے سے بالکل جدا رکھیں۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ نبی کے سوا معصوم کوئی نہیں ہوتا' غیر نبی سے خطا ہو سکتی ہے' غلطی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ غلطی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے بھی ہو سکتی ہے' حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے بھی ہو سکتی ہے اور حضرت معاویہؓ سے بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اجتہادی غلطی پر بھی اجر ملتا ہے۔ آپ نے نیک نیتی سے ایک فیصلہ کیا'

اگر چہ غلط ہو گیا' مگر اس میں نیت کے اخلاص پر بھی اجر ہے۔ یہ ہے اہلِ سنّت کا موقف!

اس اعتبار سے اہل سنت اور اہلِ تشیع کے موقف میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے اور معصوم تھے' اور جو معصوم کے مقابلے میں آیا اس کا تو اسلام بھی معتبر نہیں۔ اہل سنت کے نزدیک حضرت علیؓ معصوم نہیں' خطا ان سے بھی ہو سکتی تھی۔ اس اعتبار سے اگر کوئی کہتا ہے کہ خطا حضرت معاویہؓ کی تھی' اگر چہ بدنیتی نہ تھی' تو یہ بات درست ہے۔ اور اگر کسی کا یہ خیال ہو کہ نہیں' غلطی حضرت علیؓ کی تھی تو وہ حالات و واقعات اور دلائل و براہین کی بنیاد پر کہہ سکتا ہے۔ کیونکہ معصومیت نہ اِدھر حائل ہے نہ اُدھر۔ پھر یہ بھی مدنظر رہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان تھا کہ معاویہ! پہلے تم بیعت کرو' پھر مَیں قاتلینِ عثمانؓ سے قصاص لوں گا' جبکہ حضرت معاویہؓ کے سامنے زمینی حقائق تھے' ان کو نظر آ رہا تھا کہ قاتلینِ عثمانؓ اِس وقت حضرت علیؓ پر چھائے ہوئے ہیں' جوں ہی مَیں نے بیعت کی ان کے ہاتھوں میری گردن سلامت نہیں رہے گی' آگے قاتلینِ عثمانؓ گرفت میں آتے ہیں یا نہیں' اس کا کچھ پتا نہیں! تو یہ ہے وہ چکر جس نے سب کو حیران و سرگرداں کر دیا تھا۔ لہٰذا اس کا الزام نہ حضرت عثمانؓ کو دیجیے' نہ حضرت علیؓ کو اور نہ ہی حضرت معاویہؓ کو۔ یہ تو اغیار کا پیدا کردہ ایک چکر اور پھندا تھا جس نے اُمت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا' جس سے اُمت آج تک آزاد نہیں ہو سکی۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان — اور — سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اِسلام کی نشأۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ